سیرت

سیرۃ

خاتونِ جنّت سیّدۃ النساء

فاطمۃ الزہراء

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مؤلف

طالب الہاشمی

البدر پبلی کیشنز
۲۳- راحت مارکیٹ
اردو بازار
لاہور

سیرۃ خاتونِ جنت سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا بتولؓ

مؤلف: ـــــــ طالب الہاشمی
ایڈیشن: ـــــــ اول
تعداد: ـــــــ ایک ہزار
مطبع: میٹرو پرنٹرز، لاہور
کتابت: ـــــــ محمد حفیظ قریشی دھیڈوالی (ڈسکہ سیالکوٹ)
قیمت: ـــــــ -/۳۰ روپے
ناشر: ـــــــ البدر پبلی کیشنز ۲۳۔ راحت مارکیٹ
اردو بازار۔ لاہور

ISBN-969-400-071-8

سیرۃ خاتونِ جنّت

سیّدۃ النّساء حضرت فاطمۃ الزہراء بتول رضی اللہ عنہا

ترتیب

اُن

ماں بہنوں بیٹیوں اور بیبیوں کے نام

جنھوں نے

مغرب کی حیا سوز تحریکِ نسوانیت سے کوئی تعلق نہ رکھنے

اور

جگر گوشۂ رسولؐ سیّدۃ النساء حضرت فاطمۃُ الزہرا بتولؓ

کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم کرلیا ہے

اے ردائت پردۂ ناموسِ ما | تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما
طینتِ پاکِ تو مارا رحمت است | قوّتِ دین واساسِ ملّت است
مے تراشد مہرِ تو اطوارِ ما | فکرِ ما ، گفتارِ ما ، کردارِ ما
اے امینِ نعمتِ آئینِ حق | در نفس ہائے تو سوزِ دینِ حق

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات
ذکرِ او فرمود باطیب و صلوٰۃ

(اقبالؒ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

(از سردار علی احمد خان صاحب)

یا خالقِ ارض و سما، صلوٰۃ و سلام نازل فرمایئے ہمارے آقا و مولا جناب احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور آپؐ کی آل پر، آپؐ کے صحابہؓ اور زمرۂ احباب پر۔

اے مولائے کریم خصوصی درود و سلام ہو سیدالانبیاء والمرسلین پر جو رحمۃٌ للعالمین ہیں، سراج منیر ہیں، بشیر و نذیر ہیں، شافع روزِ محشر ہیں، ساقیٔ کوثر، صاحب قابَ قوسین، صاحبِ خلقِ عظیم اور صاحبِ خیرِ کثیر ہیں، جن کی ذاتِ گرامی تمام کمالات و صفات کی جامع ہے۔ سرکارؐ کا اسوۂ حسنہ انسانیت کا آخری معیار ہے۔ حضورؐ کی اطاعت ہی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہوتی ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ پاک عبدیت و رسالت کا منتہائے کمال ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است
(غالب)

تاریخِ عالم اس حقیقت پر گواہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہترین قبیلے

اور سب سے اعلیٰ کنبے سے مبعوث کیے گئے۔ آنحضورؐ کی شرافت وسیادت والی آلِ پاک اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم خلقِ خدا کے امام و مقتدا ہیں۔ سرکارِ دوعالم نے تا قیامت اپنے اہلِ اُمت کے لیے دو چیزیں بطور ورثہ چھوڑیں۔ اُن دو گراں قدر چیزوں میں ایک کتاب اللہ ہے اور دوسری آپؐ کی عترت و اہلِ بیت۔ اس ضمن میں امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ایک موقعہ پر اضافی ارشاد فرمایا کہ کتاب اللہ اور اہلِ بیت و عترتِ رسولِ مقبولؐ دونوں ہرگز جدا نہیں ہونگے یہاں تک کہ آپؐ سے حوضِ کوثر پر ملاقات کریں۔ حضرت احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کی چار طاہر و طیب بیٹیاں حضرت اُمّ المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطنِ نوری سے پیدا ہوئیں۔ ان صاحبزادیوں کے اسم ہائے مقدس، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت اُمِّ کلثومؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ حضرت زینبؓ باقی صاحبزادیوں سے بڑی تھیں۔ اُن کی ولادت کے وقت حضورِ اقدسؐ کی عمر شریف تیس برس تھی۔ حضرت زینبؓ نے بعثت کا زمانہ پایا اور پھر ہجرت کی۔ آپ کا عقد آپ کے خالہ زاد ابوالعاصؓ لقیط ابنِ ربیع سے ہوا۔

حضرت بی بی زینبؓ ہجرت کے آٹھویں سال فوت ہوئیں۔ حضرت زینبؓ کا ایک بیٹا علی نامی تھا جو صغر سنی میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بچہ فتح مکّہ کے روز سواری پر آقائے نامدار فخرِ موجودات سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اُن کی ایک بیٹی اُمامہؓ تھیں جن سے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا تھا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ کی ولادت

مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ اس وقت حضورؐ کی عمر تینتیسؐ سال تھی۔ حضرت رقیہؓ سیدنا عثمان غنیؓ کے نکاح میں آئیں۔ آپ کو دو ہجرتوں کی سعادت ملی یعنی حبشہ اور مدینہ منورہ کی۔ آپ نہایت خوش شکل تھیں۔ حضورؐ بدر کی مہم پر تھے جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا ان کی وفات کے بعد حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت ام کلثومؓ سے ہوا۔ بنابریں حضرت عثمانؓ کا لقب ذوالنورین ہوا حضرت ام کلثومؓ چھ برس کی ازدواجی زندگی گزار کر ہجرت کے نویں سال رحمتِ حق میں پیوست ہوگئیں۔ اُن سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی نمازِ جنازہ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھائی۔ ایک روایت کے مطابق خاتونِ جنت بی بی فاطمۃ الزہراؑ کی ولادت باسعادت سرکارِ دوجہاںؐ کی بعثت کے پہلے سال ۲۰ جمادی الاخریٰ، بروز جمعہ مکہ مکرمہ میں ہوئی، اُس وقت حضورؐ کی عمر کا اکتالیسواں سال تھا۔ بعض دوسری روایتوں میں حضرت فاطمہؓ کی پیدائش نبوت سے پانچ سال قبل بیان کی گئی ہے۔ والدِ گرامیؐ نے نومولود بیٹیؑ کا نام فاطمہ اور کنیت ام محمد رکھی اور لقب راضیہ، مرضیہ، میمونہ، زکیہ، بتول، زہرا عنایت فرمائے۔

صاحبِ روضۃ الواعظین نے لکھا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ کی پیدائش سے کافی عرصہ پہلے نبی کریمؐ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا تھا کہ مجھے روح الامینؑ نے خبر دی ہے کہ بیٹی تولد ہوگی اور اس کا نام فاطمہ رکھا جائے کہ یہ اُن کا نسلی نام ہوگا۔ اس کے معنی پاک، بابرکت، پاکیزہ اور خجستہ اطوار کے ہیں۔

ایک مرفوع روایت کے مطابق صاحبزادی کا نام فاطمہ اس لیے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اور اُن کی اولاد کو قیامت کے روز آتشِ دوزخ سے آزاد کردیا ہوا ہے۔ لقب بتول اس وجہ سے معروف ہوا کہ آپ اپنے عہد کی بیشتر خواتین سے حسب و نسب، دین، فضل، تقویٰ اور طہارت میں ممتاز ہیں۔ اس بارے

ہیں دوسری روایت یہ ہے کہ آپؑ نے دنیا سے قطع تعلق کرکے خالقِ اکبر سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔

حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؑ کے مناقب عالی، انسانی فہم و ادراک سے بالا ہیں۔ ہم تو صرف یہی جانتے ہیں کہ سیدہؑ کے والدِ گرامی سید الانبیاء والمرسلین جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ ہیں۔ آپ کے شوہرِ نامدار امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ، آپ کی مادرِ مشفق اُمّ المؤمنین سیدہ خدیجہؑ، آپ کے فرزندانِ والا گہر حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔

مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبالؒ نے رموزِ بیخودی میں کیا خوب لکھا ہے:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ

مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت

با یہودی چادرِ خود را فروخت

نوری و ہم آتشی فرماں برش

گم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا

آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او زِ بالیں بے نیاز

گوہر افشاندے بدامانِ نماز

محسنِ انسانیت رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس فقید المثال معاشرۂ انسانی کی داغ بیل ڈال کر اس کی تربیت و تکمیل فرمائی، اس کے نتیجہ میں ابنائے آدم کو

حسنِ عمل اور نورِ ہدایت کا ابدی سرچشمہ میسر آیا۔ عالم انسانیت کے لیے یہ فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم ورثہ و تحفہ ہے اور اس کے عملی نمونے اصحابِ رسولؐ، امہات المومنینؓ اور عترت و آلِ محمدؐ ہیں۔ اس پاکیزہ معاشرے کا ایک درخشاں و نمایندہ باب حضرت فاطمہؓ کی سیرتِ طیبہ ہے۔ بنت رسولِ مقبولؐ سیدہ بتولؓ نے اپنے مثالی حسنِ عمل اور ذی وقار کردار سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اولاد کے اخلاق و کردار۔ فکرِ بلند۔ علو ہمتی۔ عزائم و رجحانات اور صلاحیتوں کی تخلیق میں ماں کا کتنا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مسلمان عورت کے لیے حضرت فاطمہؓ کی سیرتِ طیبہ اسوۂ محمدی کی روشن مثال ہے اور یہ ہر زمانہ اور ہر دور میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وہ نورانی نقش کامل ہے جو تا ابد تابندہ و پائندہ رہیگا۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ اپنے والدؐ کی فرماں بردار بیٹی تھیں اور حضورؐ شافع یوم النشورؐ کی مزاج شناس بھی تھیں۔ انہوں نے اپنے والدِ معظمؐ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ آپ حضورِ اعلیٰؐ کے خُلقِ عظیم کا نمونہ تھیں۔ اخلاق و عادات اور گفتگو میں رسول اللہ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتی تھیں۔ سخاوت کا یہ عالم کہ کبھی کسی سائل کو اپنے دَر سے خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ بطور عادت آپ ہمیشہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتیں اور ہر چھوٹے بڑے سے نرمی اور مہربانی سے پیش آتیں۔

سیدہ فاطمہؓ حضرت رسالت مآبؐ کو بے حد عزیز تھیں۔ وہ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوتیں تو حضورؐ کھڑے ہو جاتے اور صاحبزادی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے پاس بٹھا لیتے۔ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہؓ کے لیے کمال درجہ پیار اور محبت بھری تکریم سیدہؓ کی فضیلت پر دال ہے اور ان کے بلند رتبہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس عالی گوہر خاتون نے آغوشِ رسالت میں اصولِ زندگی سیکھے

اور ان پر کما حقّہٗ عمل کیا۔ چنانچہ معرفتِ الٰہی۔ اطاعتِ رسولؐ۔ تقویٰ و پاکیزگی۔ عفت مآبی۔ توکل اور راضی برضائے الٰہی کے باعث آپ آسمانِ اسلام کا درخشاں ستارہ بن گئیں۔

حضرت سیدہؑ کا نکاح کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ حضور پُرنورؐ نے ایک مرتبہ حاضرینِ مجلس کو اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی بیٹی فاطمہؑ کا نکاح علیؑ بن ابی طالب سے کر دوں۔ پس تم سب گواہ ہو کہ میں نے چار سو مثقال چاندی کے حق مہر کے عوض ان کا عقد کر دیا بشرطیکہ علیؑ (جو اس وقت حاضر نہ تھے) رضامند ہوں۔ اتنے میں حضرت علیؑ تشریف لائے، انہوں نے ارشادِ نبوی سن کر عرض کیا کہ میں راضی ہوں۔ نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ زوجین کی پریشانیوں کو رفع کرے اور ان کی نسل کو معزز کرے اور میاں بیوی دونوں پر خداوندِ کریم کی برکت نازل ہو اور ان کی پاکیزہ نسل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں پھیلائے۔

امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے سیّدۂ فاطمہؑ کی زندگی میں کسی اور خاتون سے نکاح نہیں کیا۔ روایت ہے کہ جب جناب علیؑ نے جویریہ یا غورا بنت ابوجہل کو نکاح کا پیغام دیا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ منبر پر رونق افروز ہوئے اور بھری مجلس میں یوں ارشاد فرمایا:

"بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اجازت طلب کی تھی کہ وہ اپنی دُختر کا نکاح علیؑ بن ابی طالب سے کر دیں۔ میں انہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ دوبارہ کہتا ہوں کہ میں انہیں اجازت نہیں دوں گا۔ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ علیؑ بن ابی طالب میری بیٹی کو طلاق دے دے تب اُن کی بیٹی سے نکاح کرے۔ فاطمہؑ میری لختِ جگر

ہے۔ جو چیز اُسے مضطرب کرتی ہے اور جو چیز فاطمہ کو تکلیف دیتی ہے وہ مجھے تکلیف دیتی ہے۔ خدا کی قسم رسولِ خدا اور دشمنِ خدا کی بیٹیاں ایک مرد کے پاس جمع نہیں ہو سکتیں۔"

چنانچہ حضرت علیؑ نے دوسرے نکاح کا ارادہ ترک کر دیا۔

دنیاوی مال و دولت کے اعتبار سے حضرت علیؑ تنگ دست رہتے تھے۔ پیغمبرِ خدا جب اپنی چہیتی بیٹی کے ہاں مفلسی دیکھتے تو اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے لیکن صابر و شاکر بیٹی کی قناعت پر اطمینان کا اظہار فرماتے۔ دو جہان کے بادشاہ کی نورِ عین صبر و شکر کا پیکر بنی رہیں۔ کیا مجال کہ مفلسی کی شاکی ہوں۔ گھر میں کئی بار فقر و فاقہ کی نوبت آ جاتی، آپؑ خندہ پیشانی سے اس پر صبر کیا کرتیں۔ ایک روز حضرت علیؑ گھر تشریف لائے اور فوراً کچھ کھانے کو مانگا۔ سیدہؑ نے بتایا کہ مسلسل تین روز سے گھر میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ آپ نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ جواباً سیدہؑ نے فرمایا کہ اے شوہرِ محترم میرے والدِ گرامیؐ نے رخصتی کے وقت مجھے یہ نصیحت کی تھی کہ میں کبھی کوئی سوال کر کے آپ کو شرمندہ نہ کروں۔

خاتونِ جنت سیدہ فاطمہؑ گھر کا تمام کام کاج خود کرتی تھیں۔ چکی سے آٹا پیس پیس کر ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ گھر بار کی صفائی اور چولہا پھونکنے سے کپڑے میلے ہو جاتے لیکن آپؑ اس مشقت سے گھبراتی نہ تھیں۔ گھر کے دھندوں کے علاوہ یہ پاک بی بیؑ عباداتِ الٰہی بھی کثرت سے کیا کرتی تھیں۔ حضرت امام حسنؑ سے روایت ہے کہ میں نے اپنی والدۂ محترمہ کو شام سے صبح تک عبادت کرتے اور خدا کے حضور گریہ و زاری کرتے دیکھا۔ لیکن انہوں نے اپنی دعاؤں میں اپنے لیے کبھی کوئی درخواست نہ کی۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ فاطمہؓ سے پوچھا کہ مسلمان عورت کے اوصاف کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ " عورت کو چاہیے کہ خدا اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے۔ اپنی اولاد پر شفقت کرے اور اپنی نگاہ نیچی رکھے۔ اپنی زینت چھپائے۔ نہ خود غیر کو دیکھے اور نہ غیر اس کو دیکھنے پائے۔" سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحبزادی کا یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے۔

محدثین اور مؤرخین نے سیدہ فاطمہؓ کے کتنے ہی فضائل لکھے ہیں آنحضرت نے کتنی بار مختلف موقعوں پر ارشاد فرمایا کہ فاطمہؓ جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔

خداوند قدوس سے دعا ہے کہ وہ ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سیرت پاک پر عمل کرنے اور ان کے اُسوۂ حسنہ پر اپنے اخلاق و کردار کو استوار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

فاضلِ محترم جناب طالب ہاشمی مدظلّہ العالی دورِ حاضر کے ایک بلند پایہ ادیب اور معروف مؤرخ و سوانح نگار ہیں۔ صاحب موصوف ایک حقیقت پسند محقق بھی ہیں اور اہلِ علم و دانش میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ ہاشمی صاحب ایک خاموش لیکن مؤثر مبلّغِ اسلام ہیں۔ بزبانِ قلم آپ اپنے مخصوص انداز میں تبلیغ اسلام کا فریضہ بطریقِ احسن اور دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ادا کر رہے ہیں۔ اس کارِ خیر کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور دینی، دنیوی اور اُخروی سعادتوں سے مالامال کرے (آمین)

طالب ہاشمی صاحب کی نگارشات نور و حکمت کے روشن چراغوں کے مثل ہیں کہ جن کی روشنی اور حرارت اہلِ ایمان کے قلب و ذہن کو منور اور قوائے عمل کو نمودِ تازہ دے کر حرکت پذیر کرنے کا سامان پیدا کرتی ہے ــــــ آپ کی تازہ ترین تالیف "سیرتِ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ" اسلامی لٹریچر میں گرانقدر اضافہ ہے۔ فاضل مؤلف نے نہایت تحقیق سے کتاب کو مدوّن کر کے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پڑھنا اور سننا بمنزلہ عبادت ہے اور مؤلف کے لیے توشۂ آخرت۔

راجیٔ شفاعت و غفران سردار علی احمد خان ... الفقیر ... لاہور

عرضِ مؤلّف

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھ ہیچمدان ہیچمیرز کو جگر گوشۂ رسولؐ نورِ چشمِ مصطفیٰ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی سیرۃ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں نے اس کتاب کو صرف سیدۃ النساءؓ کے سوانح حیات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں ان کے بیشتر متعلقین ــــ اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ (والدہ) حضرت زینبؓ بنت رسول اللہؐ (بہن) حضرت رقیہؓ بنتِ رسول اللہؐ (بہن) حضرت اُمِّ کلثومؓ بنتِ رسول اللہؐ (بہن) حضرت فاطمہؓ بنت اسد (خوشدامن) حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ (زوج) سیدنا حضرت حسنؓ بن علیؓ (فرزند) سیدنا حضرت حسینؓ بن علیؓ (فرزند) حضرت زینبؓ بنت علیؓ (دختر) حضرت اُمِّ کلثومؓ بنت علیؓ (دختر) اور حضرت فضہؓ (خادمہ) کے سوانح حیات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کی جامع سیرت بن گئی ہے۔ چونکہ کتاب کا غالب حصہ سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کے وقائع حیات پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام "سیرۃ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ" ہی رکھا گیا ہے۔ سیدہؓ کے والدِ گرامی سرورِ کائنات

فخرِ موجودات رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرۃِ طیبہ کا مکمل احاطہ کرنا اس کتاب کے محدود صفحات میں ممکن نہ تھا اس لیے میں نے حضورِ پُر نور کی سیرۃِ طیبہ کی صرف چند ایسی جھلکیاں پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کا کچھ نہ کچھ تعلق سیدہ فاطمۃ الزہراؑ سے تھا۔

ایک مسلمان خاتون کے لیے سیرۃِ فاطمۃ الزہراؑ میں اس کی زندگی کے تمام مراحل، بچپن، جوانی، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر، خانہ داری، عبادت زہد و قناعت، پرورشِ اولاد، صدقہ و خیرات، خدمتِ خلق، اعزہ و اقربا سے محبت غرض ہر مرحلۂ حیات کے لیے قابلِ تقلید نمونہ موجود ہے۔

سیدۃ النساءؑ کے پاکیزہ نقوشِ حیات دخترانِ اسلام کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور ان کی پیروی دنیا و آخرت میں فلاح اور کامرانی کی ضامن ہے۔

اگرچہ یہ کتاب میرے خیال میں موضوع کے اعتبار سے مکمل ہے لیکن اگر اربابِ علم و دانش کو اس میں کچھ فرو گزاشتیں نظر آئیں تو وہ براہِ کرم انہیں میری کوتاہیٔ علم و نظر پر محمول کرتے ہوئے اپنے مفید مشوروں سے مستفیض فرمائیں۔ انہیں دلی شکریے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

میں جناب سردار علی احمد خان صاحب مدظلہ کا عمقِ قلب سے سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ مجھ خاکسار کے بارے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے یہ ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس حسنِ ظن کے لیے اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ (آمین)

راجیٔ غفران و شفاعت
خاکسار طالب الہاشمی
ملتان روڈ لاہور

۱۸ شوال المکرم ۱۴۰۵ھ
۷ جولائی ۱۹۸۵ء

مادراں را اسوۂ کاملِ بتولؑ
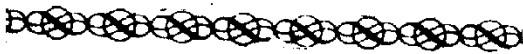
حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ
مادراں را اسوۂ کاملِ بتول

بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودی چادرِ خود را فروخت

نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

*

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامانِ نماز

*

اشکِ او برچید جبریلِ امیں
ہم چو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

*

رشتۂ آئینِ حق زنجیر پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفےٰ ست

ورنہ گردِ تربتش گردیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

---

* ـــــ حضرت سیدہ بتولؑ کی شان یہ ہے کہ وہ تسلیم و رضا کی کھیتی کا حاصل اور ماؤں کے لیے تقلید کا مکمل اور بہترین نمونہ ہیں ـــــ

* ـــــ ایک محتاج کی خاطر ان کا دل ایسا تڑپا کہ اس کی اعانت کے لیے ایک یہودی کے پاس اپنی چادر فروخت کر دی ـــــ

* ـــــ نوری بھی اور ناری بھی سب ان کے فرماں بردار تھے۔ انہوں نے شوہر کی رضا میں اپنی رضا گم کر دی۔

* ـــــ انہوں نے صبر و رضا کے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ چکی چلاتی رہتی تھیں اور لب ہائے مبارک پر قرآن کی تلاوت جاری ہوتی تھی۔

* —— ان کا گریہ تکیہ سے بے نیاز تھا وہ اپنے آنسوؤں کے موتی جا نماز پر گرایا کرتی تھیں (کیونکہ ان کی راتیں بستر پر نہیں بلکہ مصلّے پر گزرتی تھیں۔)

* —— ان کے آنسو جبریلِ امین زمین سے چُنتے تھے اور قطراتِ شبنم کی طرح انہیں عرشِ بریں پر ٹپکا دیتے تھے۔

* —— میرے پاؤں میں شریعت کے رشتے کی زنجیر پڑی ہوئی ہے اور جنابِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا پاس ہے۔

* —— ورنہ میں ان کی تربت کا طواف کرتا —— اور اپنے سجدے اس کی خاک پر نچھاور کرتا۔

خاتونِ جنّت

حضرت فاطمۃُ الزّہراء رضی اللہ عنہا

بنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نام و القاب

اسم گرامی فاطمہ ہے۔

علامہ قسطلانیؒ نے "مواہب لدنیہ" میں لکھا ہے کہ فطم کے معنی لغت میں بچے کو دودھ پینے سے روکنے کے ہیں تو گویا فاطمہؑ لوگوں کو دوزخ کی آگ سے روکنے والی ہیں۔

چند مشہور القاب یہ ہیں :

(۱) زہراء — یعنی تازہ پھول کی طرح پاکیزہ — حسین و جمیل۔
(۲) بتول۔ اللہ کی سچی اور بے لوث بندی — اللہ کی راہ میں دنیا سے قطع تعلق کر لینے والی۔
(۳) سیدۃ النساء العالمین — سارے جہانوں کی عورتوں کی سردار۔
(۴) سیدۃ النساء اہل الجنۃ — جنت کی عورتوں کی سردار۔
(۵) زاکیہ — نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ عادات و اخلاق والی۔
(۶) راضیہ — اللہ اور رسول کی رضا پر راضی رہنے والی۔
(۷) بضعۃ الرسولؐ — جگر گوشۂ رسولؐ
(۸) البضعۃ النبویۃ — نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر
(۹) ام ابیہا — کریمۃ الطرفین — باپ اور ماں دونوں کی نسبت سے عالی مرتبہ۔
(۱۰) طاہرہ — پاک باز خاتون
(۱۱) مطہرہ — پاک صاف خاتون
(۱۲) مرضیہ — اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی مرضی پر چلنے والی۔
(۱۳) عذرا — دوشیزہ

حسب و نسب

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سرورِ کونین فخرِ موجودات رحمتِ دو عالم سید الانبیاء والرسل خیر الخلائق شافعِ محشر ساقیٔ کوثر جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور محسنۂ اسلام مجسمہ شرافت فخرِ عرب اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ طاہرہ رضی اللہ عنہا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ دھدیال اور ننھیال دونوں کا تعلق عرب کے معزز ترین قبیلہ قریش سے تھا۔ پدرِ گرامیؐ اور والدہ ماجدہؓ دونوں کا سلسلۂ نسب قصیٰ پر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ شجرۂ نسب یوں ہے:

عدنان
معد
الیاس
مدرکہ
نضر
مالک ——— فہر
لؤی ——— غالب
کعب
مرہ
کلاب
قصیٰ
عبد مناف ——— عبد العزیٰ
ہاشم ——— اسد
عبد المطلب ——— خویلد
عبد اللہ
محمد الرسول اللہ ص ——— خدیجۃ الکبریٰ رض
سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رض
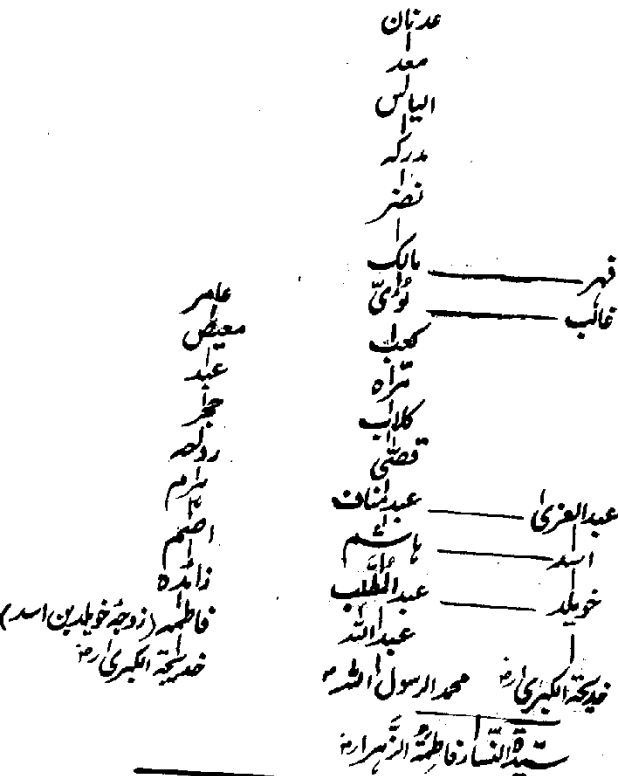
عامر
معیص
عبد
حجر
رولحہ
ہرم
اصم
زائدہ
فاطمہ (زوجہ خویلد بن اسد)
خدیجۃ الکبریٰ رض

سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا
کے والدِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم

جیسا کہ سیّدۃ فاطمۃ الزہراءؓ کے حسب و نسب میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اُس ذاتِ گرامی کی صاحبزادی تھیں جو سید الانبیاء والمرسلین تھے، صاحبِ قاب قوسین تھے، محبوبِ ربّ العالمین تھے، خیر الخلائق اور سیّد الانام تھے، رحمۃ للعالمین اور سراجِ منیر تھے، خاتم النبیین اور شفیع المذنبین تھے۔ آپؐ کی شان بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، مختصر یہ کہ:

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

خلاصۂ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ذکرِ خیر تفصیل چاہتا ہے۔ اس کتاب کے محدود صفحات میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے البتہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے چند ابواب جن سے سیّدہ فاطمۃ الزہراءؓ کا کچھ نہ کچھ تعلق ہے اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوئی تو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کی سیرتِ طیبہ پر الگ کتاب پیش کی جائے گی۔

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی

سیدۃ النساء ؑ کی والدۂ ماجدہ
اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؑ

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ بعثتِ محمدیؐ کے بعد اسلام کی خاتونِ اوّل ہیں اور اپنے گوناگوں فضائل و مناقب کی بناء پر انہیں تاریخِ اسلام میں نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔

نام خدیجہ اور لقب طاہرہ تھا، باپ کا نام خویلد اور ماں کا نام فاطمہ تھا۔ باپ اور ماں دونوں قریشی النسل تھے اور یوں وہ نہ صرف نجیب الطرفین تھیں بلکہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ کی یک جدی بھی تھیں۔

باپ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

خویلد بن اسد بن عبد العزّیٰ بن قصیّ

(قُصیّ جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی جدِ اعلیٰ تھے)

ماں کا شجرۂ نسب یہ ہے:

فاطمہ بنتِ زائدہ بن اصم بن ہرم بن رواحہ بن حجر بن عبد بن معیص بن عامر بن لؤیّ۔

(لؤیّ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی مورثِ اعلیٰ تھے)

حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد بہت بڑے تاجر تھے اور اپنی خوش معاملگی اور دیانت کی بدولت وہ تمام قریش اور عرب کے دوسرے قبائل میں بھی بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ عام الفیل سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ بچپن سے ہی نہایت سلیم الفطرت تھیں۔ جب سنِ شعور کو پہنچیں تو ان کی شادی ابو ہالہ تمیمی سے ہوئی[1] ابو ہالہ سے حضرت خدیجہؓ کے دو لڑکے ہوئے، ایک کا نام ہالہ تھا اور دوسرے کا ہند۔ ہالہ کے بارے میں اہلِ سیَر میں اختلاف ہے کہ وہ زمانہ جاہلیت میں مر گیا یا وہ شرفِ صحابیت سے بہرہ ور ہوئے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے "اِصابہ" میں ابو ہالہ کے ایک فرزند کا نام حارث لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ وہ ابتدائے بعثت میں ایمان لائے، ایک دفعہ حضورؐ نے حرمِ کعبہ میں لوگوں کو توحید کی دعوت دی تو کفار نے آپؐ پر حملہ کر دیا۔ حارثؓ بن ابو ہالہ نے سنا تو دوڑے آئے اور حضورؐ کو بچانا چاہا۔ کفار آپؐ کو چھوڑ کر حارثؓ پر ٹوٹ پڑے اور تلواریں مار مار کر انہیں اسی جگہ شہید کر دیا۔ اس طرح انہیں سب سے پہلے حضورؐ پر جان قربان کی سعادت نصیب ہوئی۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے "رحمۃ للعالمین" میں لکھا ہے کہ ابو ہالہ کی صلب سے حضرت خدیجہؓ کے تین لڑکے ہالہ، طاہر اور ہند ہوئے۔ ان تینوں بھائیوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہوا۔ ہالہ کے بارے میں انہوں نے صحیح بخاری کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضورؐ سے اندر حاضر ہونے کی

---

[1] ابو ہالہ کے نام کے بارے میں اربابِ سیَر میں سخت اختلاف ہے، کسی نے نباش بن زرارہ لکھا ہے، کسی نے ہند بن نباش اور کسی نے ابو ہالہ بن نباش لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس کا اصل نام کچھ بھی ہو، کنیت ابو ہالہ پر سب کا اتفاق ہے۔ علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ ابو ہالہ کا باپ اپنی قوم میں بڑا شریف متصور کیا جاتا تھا وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مکہ آیا تھا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

اجازت مانگی۔ حضورؐ نے ان کا نام سُن کر فرمایا اللّٰھُمَّ ھالہ ـــــ لیکن صحیح بخاری کی اصل روایت کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ واقعہ دراصل حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہؓ بنتِ خویلد سے متعلق ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ (حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد) حضورؐ سے اندر آنے کا اذن مانگا۔ ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی حضورؐ کو اس موقع پر حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں۔ آپؐ نے قدرے تامل کے بعد فرمایا " ہالہ ہوں گی۔"

طاہرؓ کے بارے میں قاضی صاحب نے "حسن الصحابہ"، "معجم البلدان" اور "استیعاب" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضورؐ نے انہیں ایک ربع یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا اور حضورؐ کے وصال کے وقت وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ ان کی حکومت میں قبائلِ عک اور اشعرئین تھے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں فتنۂ ارتداد پھیلا تو یہ قبیلے سب سے پہلے مرتد ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے طاہرؓ کو ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ طاہرؓ نے مسروقؓ بن الاجدع کے ساتھ مل کر مرتد قبائل کو شکست فاش دی۔

ہالہؓ اور طاہرؓ نے کب وفات پائی۔ کتبِ سِیَر میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ بہر حال ہالہؓ اور طاہرؓ کے بارے میں اہلِ سِیَر میں اختلاف اپنی جگہ موجود ہے۔ البتہ ہندؓ بن ابو ہالہ کے صحابی ہونے پر سب اربابِ سِیَر کا اتفاق ہے۔ ان کی پرورش خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ انہیں فصاحت و بلاغت میں کمال حاصل تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک نہایت خوبی اور صحت سے بیان کیا کرتے تھے اس لیے " وصاف النبیؐ " کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ حضرت ہند رضی اللہ عنہ نے طویل عمر پائی اور جنگِ جمل (۳۶ ہجری) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی طرف سے دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔

حافظ ابنِ عبدالبر اندلسیؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت ہندؓ کے ایک فرزند کا نام بھی ہند تھا۔ انہوں نے بصرہ میں بعارضۂ طاعون انتقال کیا تو ان کا جنازہ اٹھانے والے صرف چار آدمی تھے کیونکہ لوگ اپنے اپنے مُردوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ ایک عورت نے یہ دیکھا تو رو رو کر دہائی دینے لگی:

"واہند بن ہندؓ ابن ربیب رسول اللہ"

اس کی پکار سن کر سب لوگ اپنے عزیزوں کے جنازوں کو چھوڑ کر ان کے جنازہ پر جمع ہو گئے اور سارے بازار بند ہو گئے۔ (رحمۃ للعالمین جلد دوم)

ابو ہالہ کا انتقال جوانی کے عالم میں ہی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ (یا عابد) مخزومی سے ہوا[1] اس سے بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا۔ ہند بنت عتیق کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے بھی حضورؐ کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی اور شرفِ صحابیت حاصل کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

سرورِ کائنات ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ

---

[1] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی رائے میں حضرت خدیجہؓ کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا اور دوسرا ابو ہالہ سے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مؤرخین میں اختلاف ہے کہ عتیق سے پہلا نکاح ہوا یا ابو ہالہ سے۔ قتادہؒ نے عتیق کو پہلا بتایا ہے اور جرجانیؒ نے ابو ہالہ کو۔ صاحب الاستیعاب نے بھی قولِ جرجانی کو صحیح کہا ہے۔ میں نے قولِ قتادہؒ کو اس لیے پسند کیا ہے کہ صاحب الاستیعاب نے ہند کو ربیب رسول اللہؐ لکھا ہے اور یہ تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ ابو ہالہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح (حضرت خدیجہؓ سے) ہوا ہو!"

(رحمۃ للعالمین جلد دوم)

کے والد خویلد بن اسد" حربِ فجار" میں مارے جا چکے تھے۔ (عام الفیل کے بیس سال بعد) اور ان کے چچا عمرو بن اسد ان کے سرپرست تھے۔

خویلد بن اسد کے ترکے میں سے حضرت خدیجہؓ کو نہایت وسیع کاروبارِ تجارت ملا۔ انہوں نے اس کاروبار کو چلانے کے لیے بہت سے عرب یہودی اور عیسائی غلاموں اور ملازموں پر ایک عملہ رکھا ہوا تھا لیکن ان کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا شخص مل جائے جو بے حد قابل، ذہین اور دیانت دار ہو اور وہ اس کی نگرانی میں اپنے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ کو بھیجا کریں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق اور ستودہ صفات کا چرچا مکہ کے گھر گھر میں پھیل چکا تھا اور آپؐ کو سب اہلِ مکہ امین کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کو حضورؐ کے اوصافِ حمیدہ کا علم ہوا تو انہوں نے حضورؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ میرا سامانِ تجارت شام لے جایا کریں تو دوسرے لوگوں سے دو چند معاوضہ آپ کو دیا کروں گی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کا پیغام منظور فرما لیا اور ان کا سامانِ تجارت لے کر عازمِ بصرہ ہوئے۔ چلتے وقت حضرت خدیجہؓ نے اپنا غلام میسرہ بھی حضورؐ کے ساتھ کر دیا اور اسے تاکید کی کہ اثنائے سفر میں حضورؐ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثل دیانت داری اور سلیقہ شعاری کی بدولت تمام سامانِ تجارت دوگنے منافع پر فروخت ہو گیا۔ دورانِ سفر میں سردارِ قافلہ یعنی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ ہر ایک آپؐ کا مداح بلکہ جاں نثار بن گیا۔ جب قافلہ مکہ واپس آیا اور حضرت خدیجہؓ کو میسرہ کی زبانی سفر کے حالات اور منافع کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو ان کے دل میں بے اختیار حضورؐ کی طرف بے پناہ کشش پیدا ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ

اس سے پہلے انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان سے ایک چاند ان کی گود میں آکر گرا جس سے سارا عالم منور ہو گیا، جب انہوں نے اپنے خواب کی تعبیر ایک عیسائی عالم سے پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ:

"اے شریفۂ عرب تمہیں بشارت ہو کہ دعائے خلیلؑ و نوید مسیحاؑ کا ظہور ہو چکا ہے اور تم انؐ کے عقد میں آؤ گی۔"

حضرت خدیجہؓ کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا اور انہوں نے اپنی لونڈی نفیسہ کی معرفت حضورؐ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضورؐ کا ایماء پا کر وہ حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد کو بلا لائیں۔ اس وقت وہی ان کے سرپرست تھے دوسری طرف سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب اور دوسرے اکابرِ خاندان کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ۵۰۰ درہم طلائی مہر قرار پایا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔

نکاح کے بعد حضورؐ اکثر گھر سے باہر رہنے لگے۔ کئی کئی روز مکہ کے پہاڑوں میں جا کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ غرض اسی طرح حضورؐ غارِ حرا میں معتکف تھے کہ ربِّ ذوالجلال کے حکم سے جبریل امینؑ آپؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا "قُمْ یَا مُحَمَّدؐ"، حضورؐ نے نظریں اوپر اٹھائیں تو اپنے سامنے ایک نورانی صورت کو کھڑے پایا جس کے ماتھے پر بخطِ نور کلمۂ طیبہ رقم تھا۔ جبریل امینؑ نے حضورؐ کو گلے لگا کر دبایا اور کہا کہ پڑھ، حضورؐ نے فرمایا، میں پڑھا لکھا نہیں۔۔۔ جبرئیلؑ نے پھر یہی کہا اور حضورؐ نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ جب جبرئیلؑ نے کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ

عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

ترجمہ: "پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا جس نے انسان کو پانی کے کیڑے (لہو کی پھٹکی) سے بنایا۔ پڑھ تیرا پروردگار بہت کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے آدمی کو علم سکھایا جو نہ جانتا تھا۔"
تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہی کلمات جاری ہو گئے۔

اس حیرت انگیز واقعہ سے حضورؐ کی طبیعت بیحد متاثر ہوئی۔ گھر تشریف لائے تو فرمایا "زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ" مجھ کو کپڑا اڑھاؤ، مجھ کو کپڑا اڑھاؤ۔ حضرت خدیجہؓ نے تعمیل ارشاد کی اور پوچھا کہ آپؐ کہاں تھے میں سخت فکرمند تھی اور کئی آدمیوں کو آپؐ کی تلاش میں بھیج چکی تھی۔ حضورؐ نے تمام واقعہ بی بی خدیجہؓ کے سامنے من وعن بیان کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا کہ "آپؐ سچ بولتے ہیں۔ غریبوں کے دستگیر ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ صلۂ رحم کا خیال رکھتے ہیں، امانت گزار ہیں اور دُکھیوں کے خبرگیر ہیں۔ اللہ آپؐ کو تنہا نہ چھوڑے گا"۔۔۔۔ پھر آپؐ کو ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جو زمانۂ جاہلیت میں بُت پرستی ترک کر کے عیسائی ہو گئے تھے اور گزشتہ الہامی کتابوں، توریت، زبور و انجیل کے بہت بڑے عالِم تھے۔ بی بی خدیجہؓ نے تمام واقعہ جو حضورؐ کو پیش آیا تھا ان کے سامنے بیان کیا۔ ورقہ یہ سنتے ہی بول اٹھے:

"یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ اے کاش کہ میں اس زمانے تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔"

حضورؐ نے پوچھا، کیا یہ لوگ مجھ کو نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا "ہاں جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے جب کسی پر نازل ہوتا ہے تو دنیا اس کی مخالفت ہو جاتی ہے،

اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔" اس گفتگو کے بعد ورقہ کا بہت جلد انتقال ہو گیا تاہم حضرت خدیجہؓ کو یقین کامل ہو گیا کہ حضورؐ منصب رسالت پر فائز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بلا تامل حضورؐ پر ایمان لے آئیں۔ تمام کتب سیر متفق ہیں کہ عورتوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہونے والی خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔

حضورؐ سے نکاح کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ تقریباً ۲۵ سال تک زندہ رہیں۔ اس مدت میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر قسم کے روح فرسا مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے اسلام لانے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین میں بھی اسلام کی تڑپ پیدا ہوئی۔ نوجوانوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، بڑوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ سب سے پہلے ایمان لائے۔ ان کے بعد دوسرے سعید الفطرت اصحاب بھی آہستہ آہستہ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ حضرت خدیجہؓ کو اسلام کی وسعت پذیری سے بے حد مسرت حاصل ہوتی تھی اور وہ اپنے غیر مسلم اعزہ واقارب کے طعن وتشنیع کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو تبلیغ حق میں رسول اللہ کا دست وبازو ثابت کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا تمام زر ومال اسلام پر نثار کر دیا اور اپنی ساری دولت یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری، بیکسوں کی دستگیری اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لیے وقف کر دی۔ ادھر کفار قریش مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے اور تبلیغ حق کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکا رہے تھے۔ انہوں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثاروں کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کی لایعنی اور بیہودہ باتوں سے کبیدۂ خاطر ہوتے تو خدیجۃ الکبریٰ رض عرض کرتیں : "یا رسول اللہ آپ رنجیدہ نہ ہوں بھلا کوئی ایسا رسول بھی آج تک آیا ہے جس سے لوگوں نے تمسخر نہ کیا ہو۔" حضرت خدیجہؓ کے اس کہنے سے حضورؐ کا ملالِ طبع دور ہو جاتا تھا۔ غرض اس پُرآشوب زمانے میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض نہ صرف حضورؐ کی ہم خیال اور غمگسار تھیں بلکہ ہر موقع پر اور ہر مصیبت میں آپؐ کی مدد کے لیے تیار رہتی تھیں۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے:

"میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجھ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا تھا۔"

عفیف کندی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں زمانۂ جاہلیت میں کچھ اشیا خریدنے کے لیے مکہ آیا اور عباسؓ بن عبدالمطلب کے پاس ٹھہرا۔ دوسرے دن صبح کے وقت عباسؓ کے ہمراہ بازار کی طرف چلا۔ جب کعبہ کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص آیا۔ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا اور پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوخیز لڑکا آیا جو پہلے جوان کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک عورت آئی اور وہ بھی ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی، ان تینوں نے نماز پڑھی اور چلے گئے۔ میں نے عباسؓ سے کہا۔ "عباسؓ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں انقلاب آنے والا ہے۔" عباسؓ نے کہا۔ "ہاں، تم جانتے ہو یہ تینوں کون ہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔" عباسؓ نے کہا۔ "یہ جوان اور لڑکا دونوں میرے بھتیجے تھے، جوان عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا محمدؐ اور لڑکا ابوطالب بن عبدالمطلب کا بیٹا علیؓ تھا۔ عورت جس نے دونوں

کے پیچھے نماز پڑھی میرے بھتیجے محمدؐ کی بیوی خدیجہؓ بنت خویلد ہے۔ میرے بھتیجے کا دعویٰ ہے کہ اس کا دین الہامی ہے اور وہ ہر کام خدا کے حکم سے کرتا ہے۔ لیکن ابھی تک ان تینوں کے سوا کوئی اس دین کا پیرو میرے علم میں نہیں ہے"
عباس کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اے کاش چوتھا میں ہوتا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے کیسے نامساعد حالات میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی یہی ہمدردی، دلسوزی اور جاں نثاری تھی کہ حضورؐ ان سے بے پناہ محبت فرماتے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہیں حضورؐ نے کوئی دوسرا نکاح نہ فرمایا۔ حضرت خدیجہؓ جہاں اولاد کی پرورش نہایت حسن و خوبی سے کر رہی تھیں وہاں امورِ خانہ داری کو بھی نہایت سلیقہ سے نباہتی تھیں اور باوجود تموّل و ثروت کے حضورؐ کی خدمت خود کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ حضورؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا۔ "خدیجہؓ برتن میں کچھ لا رہی ہیں آپ ان کو اللہ کا اور میرا سلام پہنچا دیجیے۔"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خدیجہؓ کی عقیدت اور محبت کی یہ کیفیت تھی کہ بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد حضورؐ نے جو کچھ فرمایا انھوں نے ہمیشہ اس کی پُر زور تائید و تصدیق کی۔ اسی لیے حضورؐ ان کی بے حد تعریف و تحسین فرمایا کرتے تھے۔

سے بعد بعثت میں مشرکین قریش نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کیا تو حضرت خدیجہؓ بھی اس ابتلا میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، وہ پورے تین برس تک اس محصوری کے روح فرسا آلام و مصائب بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ جھیلتی رہیں۔

سنہ ۱۰ بعد بعثت میں یہ ظالمانہ محاصرہ ختم ہوا لیکن اس کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ رمضان المبارک میں (یا اس سے کچھ پہلے) ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔ حضورؐ نے علاج معالجہ اور تسکین و تشفی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن موت کا کوئی علاج نہیں۔ ۱۱ رمضان سنہ ۱۰ نبوی کو انھوں نے پیکِ اجل کو لبّیک کہا اور مکّہ کے قبرستان حجون میں دفن ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان کی وفات کا بے پناہ صدمہ ہوا اور آپؐ اکثر ملول رہنے لگے تا آنکہ حضرت سودہؓ سے آپؐ کا نکاح ہو گیا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد بھی آپؐ کو ان سے اتنی محبت تھی کہ جب کوئی قربانی کرتے تو پہلے حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو گوشت بھیجتے اور بعد میں کسی اور کو دیتے۔ حضرت خدیجہؓ کا کوئی رشتہ دار جب کبھی آپؐ کے پاس آتا تو آپؐ اس کی بیحد خاطر مدارات فرمایا کرتے۔

رحلتِ خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد مدت تک حضورؐ اس وقت تک گھر سے باہر تشریف نہ لے جاتے جب تک حضرت خدیجہؓ کی اچھی طرح تعریف نہ کر لیتے! اسی طرح جب گھر تشریف لاتے تو ان کا ذکر کر کے بہت کچھ تعریف فرماتے۔ حضرت عائشہ صدّیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے حسبِ معمول خدیجۃ الکبریٰؓ کی تعریف کرنی شروع کی۔ مجھے رشک آیا، میں نے کہا "یا رسول اللہؐ وہ ایک بڑھیا بیوہ عورت تھیں خدا نے ان کے بعد آپؐ کو ان سے بہتر بیوی عنایت کی۔" یہ سن کر حضورؐ کا چہرۂ مبارک غصّے سے سرخ ہو گیا اور فرمایا:

"خدا کی قسم مجھے خدیجہؓ سے اچھی بیوی نہیں ملی۔ وہ ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی جب سب نے مجھے

جھٹلایا۔ اس نے اپنا زر و مال مجھ پر قربان کر دیا۔ جب دوسروں نے مجھے محروم رکھا اور اللہ نے اس کے بطن سے مجھے اولاد دی۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں ڈر گئی اور اس روز سے عہد کر لیا کہ آئندہ حضورؐ کے سامنے کبھی خدیجۃ الکبریٰؓ کو ایسا ویسا نہ کہوں گی۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو چھ لڑکے لڑکیاں دیں۔ سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے جو کمسنی میں انتقال کر گئے۔ پھر زینبؓ ان کے بعد عبداللہؓ وہ بھی صغر سنی میں فوت ہو گئے (ان کا لقب طیب اور طاہر تھا) پھر رقیہؓ پھر اُمِ کلثومؓ پھر فاطمۃ الزہراؓ پیدا ہوئیں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے مناقب میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ اطہار

جمہور مسلمین اس بات پر متفق ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

صاحبزادے

(۱) حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

انہی کی نسبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم ہوئی۔ قبل از نبوت متولد ہوئے اور ایک سال پانچ ماہ کی عمر میں وفات پائی۔

(۲) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ

ان کا لقب طاہر و طیب تھا۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد پیدا ہوئے اور صغر سنی میں فوت ہو گئے۔

(۳) حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہما

۸ سنہ ہجری میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بھی کمسنی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

صاحبزادیاں

(۱) حضرت زینب رضؓ

(۲) حضرت رقیہ رضؓ

(۳) حضرت اُمِّ کلثوم رضؓ

(۴) حضرت فاطمۃ الزہراءؑ

حضرت ابراہیم رضؓ کے سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد آپؐ کی سب سے پہلی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کے بطنِ مبارک سے ہوئی۔ حضرت ابراہیم رضؓ کی والدہ حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ تھیں۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلڑ (لے پالک یا ربائب) تھیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔ سورۃ الاحزاب میں حضورؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ط

(اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں)

لفظ بنات جمع قلت ہے جس سے حضورؐ کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ کئی بیٹیاں تھیں بلکہ وہ جوان عاقلہ و بالغہ تھیں کیونکہ اس آیت میں احکامِ تکلیفیہ بیان ہو رہے ہیں اور عورتوں کو پردہ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ تمام مستند اور معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطنِ مبارک سے حضورؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضورؐ کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضؓ تھیں خود ان کی کتابوں سے آپؐ کی چار صاحبزادیاں ثابت ہوتی ہیں اس کے باوجود وہ طرح طرح کی تاویلیں کر کے اس

بات پر مُصر ہیں کہ حضورؐ کی صرف ایک بیٹی تھی اور باقی تینوں بناتِ طاہرات رضؓ کا باپ کوئی اور تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نہیں تھے (معاذ اللہ) —— اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کرنا نہایت مکروہ جرم اور سخت گناہ ہے۔ کوئی صحیح العقیدہ مسلمان قرآن کریم کی نصّ صریح اور معتبر روایات کی روشنی میں ایسا لایعنی اور بے بنیاد دعویٰ کرنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔

صاحبزادیوں کی ترتیبِ ولادت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادیوں کی تعداد پر تو تمام معتبر روایات متفق ہیں البتہ ان کی ترتیبِ ولادت کے بارے میں بعض روایتوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ابنِ سعدؒ اور ابنِ عساکرؒ نے ان کی ترتیبِ ولادت اس طرح بیان کی ہے:

(۱) حضرت زینب رضؓ
(۲) حضرت اُمِّ کلثوم رضؓ
(۳) حضرت فاطمہ رضؓ
(۴) حضرت رقیہ رضؓ

ابنِ حزمؒ اور حافظ ذہبیؒ کے نزدیک حضورؐ کی صاحبزادیوں کی ترتیبِ ولادت یہ ہے:

(۱) حضرت زینب رضؓ
(۲) حضرت رقیہ رضؓ
(۳) حضرت فاطمہ رضؓ
(۴) حضرت اُمِّ کلثوم رضؓ

حافظ ابنِ عبدالبرؒ اور بہت سے دوسرے علماء و مؤرخین نے ان کی ترتیب ولادت اس طرح بیان کی ہے :

(۱) حضرت زینبؓ

(۲) حضرت رقیہؓ

(۳) حضرت اُمّ کلثومؓ

(۴) حضرت فاطمہؓ

جمہور اربابِ علم نے اسی ترتیب کو ترجیح دی ہے اس کے مطابق حضرت فاطمہؓ حضورؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ "اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں ہے کہ :-

"عربوں میں رسم اور عادت یہ ہے کہ جب تک بڑی بہن کی شادی نہ ہو جائے، چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہوتی۔ حضرت فاطمہؓ کی بہنوں میں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ کی شادی حضرت فاطمہؓ کی شادی سے پہلے ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔

(دیکھئے ابنِ عبدالبرؒ : الاستیعاب ۴ : ۳۷۳ برحاشیہ الاصابہ مصر ۱۳۲۳ھ)

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب لاہور۔ جلد ۱۵ ص ۹۰)

سیّدہ فاطمۃ الزہراءؓ کی بہنیں

- حضرت زینبؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- حضرت ام کلثومؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت سیّدہ زینبؓ بنتِ رسول اللہ ﷺ

حضرت سیّدہ زینبؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں وہ بعثتِ نبوی سے دس سال پہلے مکّہ معظمہ میں اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطنِ مبارک سے پیدا ہوئیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک اس وقت تیس برس کی تھی۔

سیّدہ زینبؓ کی شادی کمسنی (بعثتِ نبوی سے قبل) ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع (بن عبدالعزیٰ بن عبدِ شمس بن عبدِ مناف بن قصیّ) کے ساتھ ہوئی۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ رسالت پر فائز ہوئے تو حضرت زینبؓ اپنی جلیل القدر والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی تقلید میں فوراً ایمان لے آئیں۔

بعثت کے بعد جب توحید کی دعوتِ عام کا آغاز ہوا تو کفارِ مکّہ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوتِ حق پر لبیک کہنے والوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ سیّدہ زینبؓ اپنے پدرِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے اہلِ حق سے کفار کی بدسلوکی دیکھتیں تو ان کو بہت دکھ ہوتا۔ حارث (بروایتِ دیگر حرث) غامدی کا بیان ہے کہ میں اور میرے والد حج کرنے کے لیے مکّہ گئے۔ منیٰ میں ہم نے ایک بڑا مجمع دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لوگوں نے ایک صابی (نعوذ باللہ) کے پاس ہجوم کر رکھا ہے (زمانۂ بعثت میں مشرکینِ مکّہ، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے اہلِ حق کو صابی یعنی بدمذہب کہا کرتے تھے) حارث کہتے ہیں کہ ہم بھی مجمع میں گئے اور دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور مشرکین نہ صرف

آپؐ کی ہر بات کاٹتے جاتے ہیں بلکہ آپؐ کو گالیاں اور دھکے دے رہے ہیں۔
جب بہت سا دن چڑھ آیا تو ایک خاتون جس کے ہاتھ میں پانی کا برتن اور رومال
تھا وہاں آئی اور اس بدسلوکی کو دیکھ کر جو مشرکین کا مجمع آپؐ سے کر رہا تھا، رونے
لگی۔ آپؐ نے اس سے پانی لے کر وضو کیا پھر اس خاتون سے کہا، " بیٹی صبر کرو
اور اپنے باپ کے ستائے جانے کا کچھ خیال نہ کرو یہ دن ہمیشہ اسی طرح نہیں رہیں گے۔"
میں نے دریافت کیا کہ یہ خاتون کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ یہ محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی زینبؓ ہیں۔ (بخاری فی تاریخہ و طبرانی)

ایک اور صاحب منبت بن مدرک الازدی سے روایت ہے کہ قبول اسلام
سے پہلے میں اور میرا والد حج کو گئے۔ جب منیٰ میں پہنچے تو ایک مجمع نظر آیا۔ وہاں جا
کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک صابی ہے جس نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے
میں اور میرا باپ اونٹ پر سوار تھے۔ ہم دونوں اپنے اونٹ ہجوم کے پیچھے لے گئے
اور وہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس کو دیکھنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو
سمجھاتے تھے اور مشتعل ہجوم نہایت ذلیل حرکتیں کر رہا تھا۔ کوئی شخص آپؐ پر تھوک
رہا تھا کوئی گالیاں بک رہا تھا اور کوئی پتھر، کنکر اور ڈھیلے پھینک رہا تھا لیکن آپؐ
ان کی ایذا رسانی کے باوجود توحید کی خوبیاں بیان فرما رہے تھے۔ بہت دیر اسی
کشمکش میں گزر گئی۔ آخر ایک لڑکی پانی کا ایک برتن لے کر آئی۔ وہ آپؐ کی حالت
دیکھ کر رونے لگی۔ لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ آپؐ کی صاحبزادی زینبؓ ہیں۔
آپؐ نے صاحبزادی سے فرمایا، بیٹی مت رو اور اپنے باپ کے بارے میں کسی قسم کا
خدشہ دل میں نہ لا۔ (کنز العمال بحوالہ ابن عساکر)

حضورؐ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت امِ کلثومؓ ابولہب کے
دو بیٹوں کے نکاح میں تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ کے کہنے پر دونوں صاحبزادیوں کو

(رخصتی سے پہلے) طلاق دے دی۔ کفّار نے ابوالعاص کو بھی بہت اکسایا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور حضرت زینبؓ سے نہایت اچھا سلوک کرتے رہے۔ حضورؐ نے ابوالعاصؓ کے اس طرزِ عمل کی ہمیشہ تعریف فرمائی۔ باوجود اتنی شرافت اور نیک نفسی کے ابوالعاص بعض موانع کی بناء پر اپنا آبائی مذہب ترک نہ کر سکے ـــــ حتّٰی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔ حضرت زینبؓ ان دنوں اپنے سسرال میں تھیں۔

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں بدر کے میدان میں حق اور باطل کے درمیان پہلا معرکہ ہوا، اس میں حق غالب رہا اور قریشِ مکّہ کے بہت سے آدمی مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے، ان میں ابوالعاص بھی تھے۔ انہیں ایک انصاری حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے اسیر کیا۔ اہلِ مکّہ نے جب یہ خبر سنی تو انہوں نے اپنے قرابت دار قیدیوں کی رہائی کے لیے حضورؐ کی خدمت میں زرِ فدیہ بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے بھی مکّہ سے اپنے دیور عمرو بن ربیع کے ہاتھ یمنی عقیق کا وہ ہار اپنے شوہر کی رہائی کے لیے بھیجا جو انہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے شادی کے وقت بطور تحفہ دیا تھا۔ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ ہار پیش کیا گیا تو حضورؐ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ یاد آ گئیں اور آپؐ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر آپؐ نے صحابۂ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا "اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار زینب کو واپس بھیج دو یہ اس کی ماں کی نشانی ہے۔ ابوالعاص کا فدیہ صرف یہ ہے کہ وہ مکّہ جا کر زینب کو فوراً مدینہ بھیج دیں ـــــ" تمام صحابہؓ نے ارشادِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ابوالعاص نے بھی یہ شرط قبول کر لی اور رہا ہو کر عازمِ مکّہ ہو گئے۔

مکّہ پہنچ کر ابوالعاص نے حسبِ وعدہ حضرت زینبؓ کو اپنے چھوٹے بھائی

کنانہ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ کر دیا۔ کفارِ مکہ کو معلوم ہوا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی مدینہ جا رہی ہے تو انہوں نے کنانہ بن ربیع اور حضرت زینبؓ کا تعاقب کیا اور مقام "ذی طویٰ" میں انہیں جا گھیرا۔ حضرت زینبؓ اونٹ پر سوار تھیں، کفار کی جماعت میں سے ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو اپنے نیزے سے زمین پر گرا دیا، وہ امید سے تھیں، سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا، اس پر کنانہ نے غضبناک ہو کر ترکش سے تیر نکالے اور انہیں کمان پر چڑھا کر کفار کو للکارا کہ خبردار اب تم میں سے کوئی آگے بڑھا تو اسے چھلنی کر ڈالوں گا، اسی اثناء میں وہاں رئیس قریش ابو سفیان آ گئے، انہوں نے کنانہ سے کہا، بھتیجے اپنے تیر روک لو میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

کنانہ نے پوچھا "کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ابو سفیان نے کنانہ کے کان میں کہا "محمدؐ کے ہاتھوں ہمیں جس ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے تم اس سے بخوبی آگاہ ہو، اگر تم اسؐ کی بیٹی کو اس طرح کھلم کھلا ہمارے سامنے لے جاؤ گے تو ہماری بڑی سبکی ہو گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس وقت زینبؓ کے ہمراہ مکہ واپس آ جاؤ اور پھر کسی وقت خفیہ طور پر زینبؓ کو لے جانا۔" کنانہ نے یہ بات مان لی اور حضرت زینبؓ کو لے کر مکہ واپس آ گئے۔ چند دن بعد وہ رات کے وقت چپکے سے حضرت زینبؓ کو ساتھ لے کر بطن یاجج کے مقام پر پہنچے جہاں محبوب رسولؐ حضرت زیدؓ بن حارثہ حضورؐ کے حکم کے مطابق حضرت زینبؓ کی پیشوائی کے لیے مدینہ سے آئے ہوئے تھے۔ کنانہ حضرت زینبؓ کو حضرت زیدؓ بن حارثہ کے سپرد کر کے مکہ واپس چلے گئے اور حضرت زیدؓ سیدہ زینبؓ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

ابو العاص کو حضرت زینبؓ سے بہت محبت تھی۔ سیدہؓ کے چلے جانے کے

بعد وہ بہت بے چین رہنے لگے ۔ ایک دفعہ جب وہ شام کی طرف سفر کر رہے تھے تو پُر درد آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

ذکرت زینب لما ورکت ارما فقلت سقیًا لشخص یسکن الحرما
بنت الامین جزاھا اللہ صالحۃ وکل بعل یثنی ما الذی علما

(جب میں ارم کے مقام سے گزرا تو زینب کو یاد کیا اور کہا خدا اس شخص کو شاداب رکھے جو حرم میں مقیم ہے، امینؐ کی بیٹی کو خدا جزائے خیر دے اور ہر خاوند اسی بات کی تعریف کرتا ہے جس کو وہ خوب جانتا ہے۔)

ابو العاص بڑے شریف النفس اور دیانت دار آدمی تھے، لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھتے اور وہ نہایت دیانت کے ساتھ ان کی حفاظت کرتے اور مالکوں کے طلب کرنے پر فوراً واپس دے دیتے۔ مکے میں ان کی اس قدر ساکھ تھی کہ لوگ بلا کھٹکے بلکہ بڑے اصرار کے ساتھ اپنا مالِ تجارت انہیں دے کر فروخت کے لیے دوسرے ملکوں کو بھیجا کرتے تھے۔ ۶ھ ہجری میں ابو العاص ایک تجارتی قافلہ لے کر شام جا رہے تھے کہ عیص کے مقام پر مجاہدینِ اسلام نے اس قافلے پر چھاپہ مارا اور تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ قافلہ کے تمام محافظین بھی مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے البتہ ابو العاص کسی طرح بچ نکلے اور مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت زینبؓ کی پناہ لے لی۔ سیدہ نے حضورؐ سے سفارش کی کہ ابو العاص کا مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ چونکہ ابو العاص نے مکہ میں حضرت زینبؓ سے اچھا سلوک کیا تھا اس لیے حضورؐ ان کا لحاظ کرتے تھے آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

"اگر تم ابو العاص کا مال واپس کر دو تو یہ تمہارا احسان ہو گا۔"

صحابۂ کرامؓ کو تو ہر وقت خوشنودئ رسولؐ مطلوب تھی، فوراً تمام مال و اسباب ابو العاص کو واپس کر دیا۔ وہ اسے لے کر مکہ پہنچے اور تمام لوگوں کی امانتیں

واپس کردیں۔ پھر اہلِ مکہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے اہلِ قریش اب میرے ذمہ کسی کی کوئی امانت تو نہیں ہے؟"

تمام اہلِ مکہ نے یک زبان ہو کر کہا، "بالکل نہیں۔ لات و ہبل کی قسم تم ایک نیک نہاد اور با وفا شخص ہو۔"

حضرت ابوالعاصؓ نے کہا، "تو سن لو کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ واللہ اسلام قبول کرنے میں مجھے صرف یہ بات مانع تھی کہ تم لوگ مجھے خائن نہ سمجھو۔" یہ کہہ کر کلمۂ شہادت پڑھا اور اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔

حضرت زینبؓ نے ابوالعاصؓ کو حالتِ شرک میں چھوڑا تھا اس لیے دونوں میں باہم تفریق ہو گئی تھی چنانچہ حضرت ابوالعاصؓ مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو حضورؐ نے حضرت زینبؓ اور حضرت ابوالعاصؓ کے نکاح کی تجدید فرمائی۔ تاہم شرائطِ نکاح اور حقِ مہر میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

حضرت زینبؓ اس واقعہ کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہیں اور ۸ھ ہجری میں خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ اس کا سبب وہی تکلیف تھی جو ہجرت کے موقع پر انہیں اونٹ سے گرنے کی وجہ سے پہنچی تھی۔ حضرت اُمِّ ایمنؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت اُمِّ سلمہؓ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق غسل دیا جب غسل سے فارغ ہوئیں اور حضورؐ کو اطلاع دی تو آپؐ نے اپنی تہمد مبارک عنایت فرمائی اور ہدایت کی کہ اسے کفن کے اندر زینب کو پہنا دو۔

صحیح بخاری میں مشہور صحابیہ حضرت اُمِّ عطیہؓ سے روایت ہے کہ میں بھی زینبؓ بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غسل میں شریک تھی۔ غسل کا طریقہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بتلاتے جاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا پہلے ہر عضو کو تین بار یا پانچ بار غسل دو اور اس کے بعد کافور لگاؤ ——— ایک اور روایت

میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت اُمِّ عطیہؓ سے فرمایا:

"اے اُمِّ عطیہ میری بیٹی کو اچھی طرح کفن میں لپیٹنا۔ اس کے بالوں کی تین چوٹیاں بنانا اور اسے بہترین خوشبوؤں سے معطّر کرنا۔"

نمازِ جنازہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھائی۔ حضرت ابو العاصؓ نے قبر میں اتارا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ بھی قبر میں اترے۔

جس دن سیدہ زینبؓ نے وفات پائی حضورؐ بے حد مغموم تھے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور آپؐ فرما رہے تھے "زینب میری بہت اچھی لڑکی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی۔" ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا، زینب بڑی کمزور اور ناتواں تھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس کو قبر کی تنگی اور گھٹن سے محفوظ کر دیا ہے۔

حضرت ابو العاصؓ سے حضرت زینبؓ کے دو بچے ہوئے ایک لڑکا علیؓ اور ایک لڑکی اُمامہؓ۔ علیؓ کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ بچپن میں فوت ہو گئے، دوسری روایت یہ ہے کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچنے سے پہلے اپنے والد ابو العاصؓ کے سامنے فوت ہوئے۔ فتح مکّہ کے موقع پر وہ حضورؐ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے (یعنی آپؐ کے ردیف تھے) تیسری روایت میں ہے کہ وہ جنگِ یرموک تک زندہ رہے اور اسی لڑائی میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

حضرت اُمامہؓ طویل عرصہ تک زندہ رہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ اس حالت میں مسجد میں تشریف لائے کہ ننھی اُمامہؓ شانۂ مبارک پر سوار تھیں۔ آپؐ رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے پھر جب سجدہ کے بعد کھڑے ہوتے تو پھر کندھے پر بٹھا لیتے تھے اسی طرح پوری نماز ادا فرمائی۔

ایک دفعہ کہیں سے تحفہ میں ایک قیمتی ہار آیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ہار میں اس کو دوں گا جو میرے اہلِ خانہ میں مجھ کو سب سے محبوب ہو گا۔ ازواجِ مطہرات کو خیال ہوا کہ شاید یہ ہار حضرت عائشہ صدیقہؓ کو مرحمت ہو لیکن آپؐ نے حضرت اُمامہؓ کو بلایا اور وہ ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔

(اُسدُ الغابہ لابنِ اثیرؒ، الاستیعاب لابنِ عبدالبرؒ)

بعض روایتوں میں ہے کہ شاہِ حبشہ نجاشی نے ایک انگوٹھی حضورؐ کی خدمت میں ہدیۃً بھیجی تھی۔ آپؐ نے یہ انگوٹھی حضرت اُمامہؓ کی انگلی میں پہنا دی۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے چند ماہ بعد جب حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے وفات پائی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت اُمامہؓ سے نکاح کر لیا۔ سنہ ۴۰ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد وہ مغیرہ بن نوفل کے نکاح میں آئیں۔ ان کی صلب سے ایک لڑکا یحییٰ پیدا ہوا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت اُمامہؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت اُمامہؓ کا انتقال مغیرہ ہی کے گھر میں ہوا۔

حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت زینبؓ کے شوہر حضرت ابوالعاصؓ نے سنہ ۱۳ھ میں وفات پائی۔

حضرت سیّدہ رقیہؓ بنتِ رسول اللہ ﷺ

حضرت سیّدہ رقیہؓ سرورِ کونین ﷺ کی دوسری صاحبزادی تھیں۔ جو بعثتِ نبویؐ سے سات سال پہلے اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطنِ مبارک سے پیدا ہوئیں۔

سیّدہ رقیہؓ کا پہلا نکاح اپنے ابنِ عم عتبہ بن ابی لہب سے ہوا۔ حضورؐ کے اعلان کے بعد (اور بعض روایتوں کے مطابق سورہ تَبَّتۡ یَدَآ اَبِیۡ لَهَبٍ کے نزول کے بعد) عتبہ نے اپنے باپ ابی لہب کے حکم کے مطابق حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی [1] ان کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

---

[1] یہی عتبہؓ فتح مکہ کے موقع پر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ ان کے بھائی معتب بن ابی لہب نے بھی اسی موقع پر اسلام قبول کر لیا۔

علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ دونوں بھائیوں کے سعادت اندوزِ اسلام ہونے پر سرورِ عالمؐ کو بیحد مسرت ہوئی۔ آپؐ دونوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بابِ کعبہ اور حجرِ اسود کے درمیان لے گئے اور کچھ دعا کی۔ اس وقت حضورؐ کا روئے انور فرطِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آپ بہت خوش نظر آتے ہیں؟" فرمایا، "میں نے اپنے ان بھائیوں کو اللہ سے مانگا تھا اس نے مجھے دے دیئے اسی لیے میں خوش ہوں۔"

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عتبہؓ غزدۂ حنین اور غزوۂ طائف میں شریک ہوئے اور بڑی پامردی سے لڑے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عتبہؓ بن ابی لہب نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

اس واقعہ کے بعد سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو اپنی دامادی کے لیے منتخب فرمایا۔ وہ بنو امیہ کے ایک ممتاز فرد تھے اور نہایت اعلیٰ اوصاف وخصائل سے متصف تھے۔ ان کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ انہیں حضورؐ کا خویش بننے کا شرف حاصل ہو۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی۔

مکہ میں جب کفار نے مسلمانوں کو بیحد ستایا تو حضورؐ نے انہیں حبش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵ھ نبوت میں کچھ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ بھی حضرت رقیہؓ کے ہمراہ حبش کو ہجرت کر گئے۔ حضورؐ کو ان کی ہجرتِ حبشہ کی خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا:

"ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت کی ہے۔"

چند ماہ بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ حبش سے مکہ واپس آ گئے لیکن کفار کی ایذا رسانیاں پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ دوبارہ حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ عرصہ تک حضورؐ کو ان کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی تو آپ بہت متفکر ہوئے۔ ایک دن کسی عورت نے آکر خبر دی کہ میں نے عثمانؓ اور رقیہؓ کو بچشمِ خود حبش میں بخیریت دیکھا ہے۔ حضورؐ کو اطمینان ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر بھی آپؐ نے فرمایا:

"اللہ ان دونوں پر رحم فرمائے، عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ہجرت کی۔"

کافی عرصہ بعد حبش میں قیام کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو خبر ملی کہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ دوسرے مسلمانوں اور حضرت رقیہؓ کے ہمراہ حبش سے مکّہ واپس آ گئے اور پھر چند دن کے بعد حضورؐ کی اجازت سے مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں حضرت اوسؓ بن ثابت کے گھر اترے۔ سنہ ۲ ہجری میں جب حضورؐ غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہو رہے تھے، حضرت رقیہؓ کو چیچک نکل آئی، آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو حکم دیا کہ وہ رقیہؓ کی خبر گیری کے لیے مدینہ ہی میں ٹھہریں اس کے عوض اللہ تعالیٰ انہیں جہاد میں شریک ہونے کا ثواب بھی دے گا اور مالِ غنیمت میں سے بھی انہیں حصہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ مدینہ منوّرہ میں ہی ٹھہر گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی بدر سے مراجعت نہیں فرمائی تھی کہ حضرت رقیہؓ کی تکلیف بڑھ گئی اور انہوں نے اکیس۲۱ سال کی عمر میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ عین اس وقت جب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، حضرت زیدؓ بن حارثہ فتح بدر کی خوشخبری لے کر مدینہ منوّرہ میں داخل ہوئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی لختِ جگر کی وفات کی اطلاع ملی تو آپؐ کو سخت صدمہ پہنچا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مدینہ منوّرہ واپس پہنچ کر آپؐ حضرت رقیہؓ کی قبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"عثمانؓ بن مظعون جا چکے اب تم بھی ان سے جا ملو۔" (عثمانؓ بن مظعون پہلے مہاجر تھے جنھوں نے مدینہ آکر وفات پائی تھی) حضورؐ کے اس ارشاد پر عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں سختی سے منع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، "عمر انہیں رونے دو، دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی حرج نہیں البتہ نوحہ و بین سے بچنا چاہیے کہ یہ شیطانی حرکت ہے۔"

حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور

قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضورؐ اپنی چادر مبارک کے کناروں سے ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

حضرت رقیہؓ کے قیام حبش کے دوران میں ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اسی صاحبزادے کی نسبت سے حضرت عثمانؓ کی کنیت ابوعبداللہ مشہور ہوئی۔ سیدہ رقیہؓ نے وفات پائی تو عبداللہؓ صرف چار برس کے تھے۔ دو برس بعد ان کو ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک مرغ نے ان کی آنکھ میں چونچ مار دی جس سے سارا چہرہ متورم ہوگیا۔ اسی تکلیف سے انہوں نے جمادی الاوّل سنہ ۴ھ میں وفات پائی۔ حضورؐ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت عثمانؓ نے قبر میں اتارا۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ میں باہم بے حد محبت تھی۔ ان کے تعلقات اتنے خوشگوار اور مثالی تھے کہ لوگوں میں ان کی نسبت یہ مقولہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا:

"احسن الزوجین راھما الانسان رقیہؓ وزوجھا عثمانؓ"

یعنی رقیہؓ اور عثمانؓ سے بہتر میاں بیوی کسی انسان نے نہیں دیکھے

حضرت سیدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ

حضرت سیدہ اُمِ کلثوم رضؓ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی ہیں۔ بعض اہلِ سیر نے ان کا نام امیہ لکھا ہے لیکن انہوں نے اپنی کنیت اُمِ کلثوم رضؓ سے شہرت پائی۔

حضرت اُمِ کلثوم رضؓ بعثتِ نبوی سے چھ سال قبل اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطنِ مبارک سے پیدا ہوئیں۔ وہ حضرت رقیہ رضؓ سے ایک سال چھوٹی اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضؓ سے ایک سال بڑی تھیں۔

حضرت اُمِ کلثوم رضؓ کا نکاح بعثتِ نبوی سے پہلے اپنے ابنِ عم عتیبہ بن ابولہب سے ہوا۔ بعثتِ نبوی کے چند سال بعد جب سورہ تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ نازل ہوئی تو ابولہب کو سخت غصہ آیا۔ اس کے ایک بیٹے عتبہ کے نکاح میں رقیہ رضؓ بنتِ رسول اللہ تھیں اور دوسرے بیٹے عتیبہ سے حضرت اُمِ کلثوم رضؓ کا نکاح ہوا تھا (لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی) ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا:

"میرا اٹھنا بیٹھنا تمہارے ساتھ حرام ہے اگر تم نے اس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لڑکیوں کو طلاق نہ دی۔

دونوں بیٹوں نے بدبخت باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ عتبہ نے سیدہ رقیہ رضؓ کو اور عتیبہ نے سیدہ اُمِ کلثوم کو طلاق دے دی۔ (رخصتی سے پہلے)

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ واقعہ حضورؐ کے اعلانِ نبوت کے بعد (اور

سورۂ تبّت یدا ابی لھب کے نزول سے پہلے) پیش آیا [1]

واقعۂ طلاق کے بعد حضرت رقیہؓ حضرت عثمان غنیؓ کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ ۲ھ ہجری میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت عثمانؓ کو ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ اسی زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ بیوہ ہوگئیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حضرت حفصہؓ سے نکاح کرلیں لیکن انہوں نے تامل کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ میں تم کو حفصہؓ کے لیے

---

[1] عتیبہ بھی اپنے والد کی طرح سخت اسلام دشمن تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی ذہانتِ طبع کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کہنے لگا "میں النجم اذا ھوٰی اور الذی دنا فتدلّٰی کا انکار کرتا ہوں۔" بدبخت نے یہی کہنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپؐ پر پڑا نہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ آگئے۔

"الٰہی اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کردے۔"

اس واقعہ کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوا۔ اثنائے سفر میں قافلے نے ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں رات کو درندے آتے تھے۔ وہاں کے باشندوں نے ابولہب کو اس خطرہ سے آگاہ کیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ عتیبہ کی حفاظت کا اچھی طرح انتظام کریں کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا سے خوف آتا ہے۔ اس پر اہلِ کارواں نے عتیبہ کے چاروں طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے اور سو گئے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے بیچوں بیچ سے ہوتا ہوا عتیبہ پر جا پڑا اور اس کو پھاڑ کھایا۔

عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں اور عثمانؓ کے لیے حفصہؓ سے بہتر رشتہ بتاتا ہوں۔ پھر فرمایا، حفصہؓ کا نکاح مجھ سے کر دو اور میں اپنی بیٹی کی شادی عثمانؓ سے کر دیتا ہوں جو رقیہؓ کے فوت ہو جانے سے بہت دل گرفتہ ہے۔ حضرت عمرؓ فوراً رضامند ہو گئے۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ کا نکاح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا اور حضرت اُمِ کلثومؓ کا نکاح حضورؐ نے حضرت عثمانؓ سے پڑھا دیا۔ حقِ مہر وہی مقرر رہا جو حضرت رقیہؓ کا تھا۔

حضرت اُمِ کلثومؓ اس نکاح کے بعد چھ سال تک زندہ رہیں۔ شعبان ۹ ہجری میں انہوں نے وفات پائی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب، حضرت اُمِ عطیہؓ، لیلیٰؓ بنتِ قائف اور حضرت اسماءؓ بنتِ عمیس نے حضورؐ کی ہدایت کے مطابق غسل دیا۔ حضورؐ نے کفن کے لیے اپنی چادر مبارک دی اور خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت ابوطلحہؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت اسامہؓ بن زید اور حضرت فضل بن عباسؓ حضورؐ کی اجازت سے قبر میں اترے اور سیدہ کو جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جس وقت سیدہؓ کو قبر میں اتارا گیا، حضورؐ قبر کے پاس تشریف فرما تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سیدہ اُمِ کلثومؓ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

سیّدہ فاطمۃ الزّہراء سلام اللہ علیہا

ولادت
سے
سنِ شعور تک

ولادتِ باسعادت

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی تاریخِ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے اس سلسلہ کی مشہور روایات یہ ہیں:

(۱) آپ بعثت نبوی سے پانچ سال قبل اس زمانے میں پیدا ہوئیں۔ جب قریش خانۂ کعبہ کی ازسرِنو تعمیر میں مشغول تھے۔ اس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک ۳۵ سال کی تھی اور اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی پچاس سال۔

(۲) آپ پہلے سالِ نبوّت کے ماہ جمادی الاخریٰ کی بیس تاریخ کو پیدا ہوئیں۔ (سنہ ۱ بعثت یا سنہ ۴۱ ولادتِ نبوی مطابق سنہ ۶۱۱ عیسوی)

(۳) آپ بعثت سے تقریباً ایک سال پہلے پیدا ہوئیں۔

(۴) آپ کی ولادت سنہ ۵ بعثت (نبوّت) میں ۲۰ جمادی الاخریٰ کو ہوئی۔

جمہور اربابِ سیَر نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اور درایت کی رو سے بھی یہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اکثر مستند روایتوں میں وفات (سنہ ۱۱ھ) کے وقت سیدہؓ کی عمر ۲۸ یا ۲۹ سال بتائی گئی ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سیدہؓ کی ولادت بعثت سے تقریباً پانچ سال قبل تسلیم کیا جائے ہم نے اس کتاب میں اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔

بچپن سے سنِ شعور تک

کتبِ حدیث اور سیر و تاریخ میں سیدۃ النساءؓ کی ابتدائی زندگی کے بہت کم واقعات ملتے ہیں۔ صرف چند روایات ہیں جن سے ان کے بچپن سے سنِ شعور تک کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ بات صرف سیدۃ النساءؓ کی ذاتِ گرامی تک محدود نہیں بلکہ دوسری بناتِ طاہراتؓ، ازواجِ مطہراتؓ اور بیشتر صحابہ کرامؓ و صحابیاتؓ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اہلِ سیر اور مؤرخین نے زیادہ توجہ خاص ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ بیان کرنے پر دی ہے اور آپؐ کے متعلقین (اولادؓ، ازواجؓ اور صحابہؓ) کے بالعموم وہی حالات بیان کیے ہیں جن کا براہِ راست حضورِ پُرنورؐ سے تعلق تھا یا اسلامی سیاست اور ریاست سے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سیرت کی قدیم کتابوں میں سیدۃ النساءؓ کے ذکر سے دانستہ اغماض برتا گیا۔ بہرصورت جو تھوڑی بہت روایات ملتی ہیں ان سے سیدۃ النساءؓ کے بچپن سے جوانی تک کے حالات کا کچھ نہ کچھ علم ضرور ہو جاتا ہے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ فطری طور پر ہی نہایت متین اور تنہائی پسند طبیعت کی مالک تھیں۔ بچپن میں انہوں نے نہ کبھی کھیل کود میں حصہ لیا اور نہ گھر سے باہر قدم نکالا۔ چونکہ والدین کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں اس لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو ان سے غایت درجہ کی محبت

تھی۔ ننھی سیّدہؓ بچپن ہی میں اپنے فخرِ موجودات پدرِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادات و اطوار، رفتار و گفتار کو غور سے دیکھتی رہتی تھیں اور حضورِ پُرنورؐ کی عاداتِ مقدسہ کو اپنے آئینۂ قلب پر منعکس کرتی رہتی تھیں۔ سیّدالانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی باہر سے تشریف لاتے تو بلند آواز میں "السّلام علیکم" کہتے اور پھر چند لمحے توقف کرکے گھر کے اندر داخل ہوتے۔ ننھی سیّدہؓ اپنے برگزیدہ اور پیارے باپؐ کی آواز سن کر گھر کے دروازے تک دوڑی جاتیں اور حضورؐ کی انگشتِ مبارک پکڑ کر ساتھ لاتیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نشست گاہ میں پہنچ کر سیّدہؓ کو اپنی آغوشِ مبارک میں لے لیتے اور نہایت شفقت اور محبت کے ساتھ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے۔

ننھی سیّدہ وقتاً فوقتاً رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ایسے ایسے سوالات پوچھتیں جن سے ان کی ذہانت اور فطانت کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک دن ننھی سیّدہؓ نے اپنی والدہ ماجدہ سے پوچھا کہ اماں جان، اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں اور دنیا کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ہمیں نظر بھی آسکتا ہے؟

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے فرمایا۔ "بیٹی اگر ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس کے بندوں کے ساتھ ہمدردی اور نیکی کریں۔ اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہیں، کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں، صرف اسی کی عبادت کے لائق سمجھیں اور اللہ کے رسول پر ایمان لائیں تو قیامت کے دن ہم ضرور اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ اس دن نیکی اور بدی کا حساب بھی ہوگا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لاتے تو ننھی فاطمہؓ کو ایسی ایسی باتیں سکھلاتے جن سے خداشناسی اور اللہ کے بندوں سے محبت کا سبق ملتا۔ مبداءِ فیض نے انہیں کمال درجے کی ذہانت عطا کی تھی۔ جو بات ایک دفعہ سن

لیتیں ہمیشہ یاد رکھتی تھیں۔ جب حضورؐ گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ننھی سیدہؓ سے دریافت کرتیں کہ آج اپنے آبا جان سے کون کون سی باتیں سیکھی ہیں، وہ فوراً سب کچھ بتا دیتیں۔

سیدہ فاطمہؓ کو دنیا کی نمود و نمائش سے بچپن ہی میں سخت نفرت تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے کسی عزیز کی شادی تھی انہوں نے اپنی بچیوں کے لیے اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اچھے اچھے کپڑے اور زیور بنوائے۔ جب گھر سے چلنے کا وقت آیا تو سیدہ فاطمہؓ نے یہ کپڑے اور زیور پہننے سے صاف انکار کر دیا اور معمولی کپڑوں میں ہی محفل شادی میں شریک ہوئیں۔ گویا بچپن سے ہی ان کے عادات و اطوار سے خدا دوستی اور استغناء کا اظہار ہوتا تھا۔

بعثت کے بعد سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم تین سال تک نہایت راز داری کے ساتھ فریضۂ تبلیغ ادا فرماتے رہے جب چوتھے سال کے آغاز خدائے حکیم و برتر کی طرف سے واضح حکم آیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(احکامِ الٰہی برملا سنائیے اور مشرکوں کی طرف سے منہ پھیر لیجیے یعنی ان کی مخالفت کی پروا نہ کیجیے)

تو حضورؐ نے ہر خاص و عام کو علانیہ حق کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ اس پر کفارِ مکہ آپؐ کے درپئے آزار ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہی قریش جو آپؐ کی عظمت کردار کے دل و جان سے معترف تھے اور جن کی زبانیں آپؐ کو صادق اور امین کہتے کہتے نہیں تھکتی تھیں، اب آپؐ کے

خون کے پیاسے بن گئے۔ ان لوگوں کے دو گروہ تھے، ایک گروہ اسلام کا دشمن تو ضرور تھا لیکن وہ حضورؐ کو جسمانی ایذا دینے سے اجتناب کرتا تھا۔ اس گروہ میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان جیسے لوگ شامل تھے۔ دوسرے گروہ کو کسی ذلیل سے ذلیل اور کمینہ سے کمینہ حرکت سے بھی اجتناب نہ تھا اس میں ابولہب، ابوجہل، عُقبَہ بن ابی مُعَیط، اسود بن عبدِ یغوث، ولید بن مغیرہ، عدی بن حمراء، نضر بن الحارث، ابن الاصداء اور امیہ بن خلف وغیرہ جیسے بدطینت لوگ شامل تھے۔ اہلِ سیَر نے متعدد واقعات بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہاتھ دھو کر حضورؐ کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ سنہ ۱۰ نبوت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد تو وہ حضورؐ کو ایذائیں پہنچانے میں بہت جری ہو گئے۔ حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھانا، آپؐ کے سرِ اقدس پر خاک اور کیچڑ پھینکنا، آپؐ کا گلا گھونٹنا، پشتِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ رکھنا، گالیاں دینا، تمسخر اڑانا اور اسی قسم کی چھچھوری اور کمینہ حرکات ان بدبختوں سے اسی زمانے میں سرزد ہوئیں۔ حضورؐ کے ساتھ انہوں نے آپؐ کی دعوت قبول کرنے والوں کو بھی اپنے جور و تعدی کا نشانہ بنا لیا تھا اور ان پر ایسے ایسے ستم ڈھاتے رہتے تھے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ جاتی تھی۔ سیّدہ فاطمہؓ نے ایسے ہی نامساعد حالات میں پرورش پائی۔ وہ اپنے عظیم باپؐ اور آپؐ کے نام لیواؤں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھتیں تو بہت آزردہ ہوتیں لیکن کم سنی کے باوجود وہ ان حالات سے کبھی خوفزدہ نہ ہوئیں بلکہ ہر مشکل موقع پر حضورؐ کی غمگساری اور خدمت کی۔ کسی وقت بتقاضائے فطری حضورؐ کی مصیبتوں پر اشکبار ہو جاتیں تو حضورؐ انہیں تسلی دیتے اور فرماتے:

"میری بچی گھبراؤ نہیں، خدا تمہارے باپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔"

تبلیغ حق کے دوران میں کفّار حضورؐ کے ساتھ کوئی شرارت کرتے اور سیدہؑ کو خبر پہنچتی تو وہ بے چین ہو جاتیں ۔ حضورؐ گھر تشریف لاتے تو دوسری بہنوں کے ساتھ وہ بھی حضورؐ کو تسلی دیتیں ، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے رو دھو کر حضورؐ کو تبلیغ حق سے منع کیا ہو۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبۂ معلّی کے نزدیک مصروفِ نماز تھے قریب ہی کفارِ قریش نے مجلسِ لہو گرم کر رکھی تھی ابوجہل کو شرارت جو سوجھی تو اس نے اہلِ مجلس سے مخاطب ہو کر کہا ـــــ " ذرا اس شخص (حضورؐ) کی طرف تو دیکھو ، کاش اس وقت کوئی شخص فلاں قبیلہ میں جاتا ، وہاں اونٹ ذبح ہوا ہے اس کی اوجھ (اوجھڑی) اٹھا لاتا اور یہ شخص جب سجدہ میں جاتا تو اس کی پیٹھ (یا گردن) پر رکھ دیتا ۔"

عقبہ بن ابی معیط نے کہا " یہ کام میں کروں گا " چنانچہ وہ لپک کر گیا اور خون اور گوبر سے بھری ہوئی اونٹ کی اوجھ لا کر ایسی حالت میں حضورؐ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھ دی جب کہ آپ سر بسجود تھے ۔ کفار کو یہ منظر دیکھ کر اس قدر مسرت ہوئی کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے تھے ۔ اونٹ کی اوجھ بڑی وزنی ہوتی ہے حضورؐ کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی ۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود اس زمانے میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے ، اشرار کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی البتہ دوڑتے ہوئے حضورؐ کے گھر پہنچے اور اس واقعہ کی اطلاع دی ـــــ سیّدہ فاطمہؑ یہ خبر سن کر بے چین ہو گئیں ۔ دوڑتی ہوئی کعبہ پہنچیں اور حضورؐ کی گردن مبارک سے اوجھ ہٹائی ۔ کفار ارد گرد کھڑے ہو کر ہنستے اور تالیاں پیٹتے تھے ۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لختِ جگر نے ایک نگاہِ خشم آلود ان پر ڈالی اور فرمایا ـــــ " شریرو! احکم الحاکمین تمہیں ان

شرارتوں کی سزا دے گا "

ایک اور روایت میں ہے کہ سیّدہ نے اس موقع پر مشرکینِ قریش کو بہت بد دعائیں دیں اور عُقبہ بن ابی مُعیط کو بھی بہت بُرا بھلا کہا۔

صحیحین میں ہے کہ اس موقع پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اشقیاء قریش کے لیے بد دعا کی اور فرمایا "الٰہی کفار کی اس ٹولی کو سزا دے۔"

اس بد دعا میں آپؐ نے ابوجہل، عُقبہ بن ابی مُعیط، امیّہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا خاص طور پر نام لیا۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ مجھے اس ذاتِ برحق کی قسم جس نے حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی مبعوث فرمایا، میں نے ان اشخاص کو جن کا نام لے کر آپؐ نے بد دعا کی تھی، بدر کے میدانِ جنگ میں ذلّت کے ساتھ پڑا پایا۔ ان کی لاشیں گھسیٹ کر ایک گڑھے (کنوئیں) میں ڈالی گئی تھیں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

امام جلال الدین سیوطیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے ابتدائی زمانے میں ایک دن ابوجہل نے سیّدہؓ فاطمہؓ کو کسی بات پر تھپڑ مار دیا، کمسن سیّدہ روتی روتی حضورؐ کے پاس گئیں اور ابوجہل کی شکایت کی۔

آپؐ نے ان سے فرمایا:

"بیٹی جاؤ اور ابوسفیان کو ابوجہل کی اس حرکت سے آگاہ کرو۔"

وہ ابوسفیان کے پاس گئیں اور انہیں سارا واقعہ سنایا ـــــ ابوسفیان نے ننھی فاطمہؓ کی انگلی پکڑ لی اور سیدھے وہاں پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے سیّدہؓ سے کہا ـــــ "بیٹی جس طرح اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تھا

تم بھی اس کے منہ پر تھپڑ مارو۔ (اگر یہ کچھ بولے گا تو میں اس سے نبٹ لونگا)"
چنانچہ سیدہؑ نے ابو جہل کو تھپڑ مارا اور پھر گھر جا کر حضورؐ کو یہ بات بتائی،
آپؐ نے دعا کی:

"الٰہی ابو سفیان کے اس سلوک کو نہ بھولنا۔"

حضورؐ کی اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ چند سال بعد ابو سفیانؓ نعمتِ اسلام
سے بہرہ ور ہو گئے۔

(سیرۃ نبویہ سید احمد زینی دحلان برحاشیہ سیرۃ حلبیہ جلد ۲)
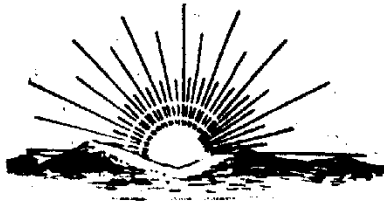
شعبِ ابوطالب کی محصوری

سنہ ۶ ہجری میں جب عمِّ رسول حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن خطاب نے اسلام قبول کیا تو مشرکین قریش فرطِ غضب سے دیوانے ہو گئے اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ تمام اکابرِ قریش نے جمع ہو کر بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے ان کے حوالے نہ کریں گے کوئی شخص ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا، نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کی جائے گی، نہ ان سے رشتہ ناتا کیا جائے گا اور نہ انہیں کھلے بندوں پھرنے دیا جائے گا۔ اس فیصلہ کو معرضِ تحریر میں لا کر ہر قبیلہ کے نمائندے نے دستخط کیے یا انگوٹھا لگایا اور پھر اسے درِ کعبہ پر آویزاں کر دیا۔

جب بنو ہاشم کو اس خوفناک معاہدے کا علم ہوا تو وہ مطلق ہراساں نہ ہوئے اور مشرکین کا مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ خاندان کے بزرگ حضرت ابوطالب، ہاشم اور مطلب کی تمام اولاد و احفاد کو ساتھ لے کر شعبِ ابی طالب میں پناہ گزین ہو گئے۔ ان پناہ گزینوں میں بوڑھے جوان عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔ صرف ابولہب اور اس کے زیرِ اثر چند ہاشمیوں نے مشرکین کا ساتھ دیا۔

شعبِ ابی طالب سے متعلق مختلف روایتیں ہیں کسی روایت میں اسے دامنِ کوہ کا ایک کشادہ مکان بتایا گیا ہے اور کسی میں اسے پہاڑ کا ایک درہ بتایا گیا ہے جو خاندانِ ہاشم کا موروثی تھا۔

مشرکینِ مکہ نے یکم محرم سنہ ۷ بعد بعثت کو شعبِ ابی طالب کا محاصرہ کر

لیا اور اس میں اتنی سختی برتی کہ کھانے پینے کی کوئی چیز محصورین کو نہ پہنچنے دیتے تھے۔ باہر سے اگر کوئی سوداگر غلّہ فروخت کرنے کے لیے لاتا تو اس سے ایک ایک دانہ خرید کر قابو میں کر لیتے تاکہ اسے محصورین نہ خرید سکیں۔ بنو ہاشم اور بنو مُطّلب کے بچے جب بھوک سے بے تاب ہو کر روتے تھے تو مشرکین ان کی آوازیں سُن سُن کر خوش ہوتے تھے۔ عورتوں کی چھاتیوں میں دودھ خشک ہو گیا تھا۔ محصورین کے منہ میں کئی کئی دن تک ایک کھیل بھی اڑ کر نہ جاتی تھی۔ اگر کبھی حضرت ابوبکر صدیق یا دوسرے غیر ہاشمی جان نثار چوری چھپے جان جوکھوں میں ڈال کر کوئی چیز شعبِ ابی طالب میں پہنچاتے تو اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی کہ چند دن بھی ساتھ نہ دیتی۔ چنانچہ بے کس محصورین درختوں اور جھاڑیوں کی پتیاں اُبال اُبال کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رات کو انہیں سوکھے ہوئے چمڑے کا ایک ٹکڑا کہیں سے مل گیا۔ انہوں نے اسے پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور کوٹ کر پانی میں گھولا اور ستو کی طرح پیا لے[1]

(روض الانف سہیلیؒ)

غرض بنو ہاشم اور بنو مُطّلب مسلسل تین برس تک شعبِ ابی طالب میں زہرہ گداز اور حوصلہ فرسا مصائب و آلام کا شکار رہے۔ سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ نے بھی مصیبت کا یہ زمانہ اپنے عظیم المرتبت والدین اور دوسرے اعزّہ و اقارب کے ساتھ محصوری میں گزارا اور تمام سختیاں بڑے صبر و استقامت

لے[1] سیّدنا حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص اگرچہ نہ ہاشمی تھے اور نہ مُطّلبی لیکن انہوں نے برضاءِ رغبت اس مصیبت میں رسولِ اکرمؐ کا ساتھ دیا تھا۔

کے ساتھ برداشت کیں۔ ان تین سالوں کے دوران میں جب حج کا موسم آتا تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مردانہ وار شعبِ ابی طالب سے نکلتے اور لوگوں کو دعوتِ توحید دیتے۔ بدبخت ابولہب حضورؐ کے پیچھے پیچھے پھرتا اور لوگوں سے کہتا، "لوگو! میرا یہ بھتیجا دیوانہ (نعوذ باللہ) ہوگیا ہے۔ اس کی باتوں پر مت دھیان دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

محصوری کا خاتمہ

مشرکین میں بعض رحم دل آدمی بھی تھے۔ ان کا دل بنو ہاشم کی مصیبت پر کڑھتا تھا لیکن ان سے علانیہ ہمدردی کا اظہار کرکے عامۃ المشرکین سے عداوت مول لینے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا لیکن ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے (جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے) اپنے غلام کے ہاتھ کچھ گندم اپنی پھوپھی (حضرت خدیجہؓ) کو دینے کے لیے روانہ کی۔ راستے میں اسے ابوجہل مل گیا، پوچھا "گندم کہاں لیے جارہے ہو۔"

اس نے کہا "شعبِ ابی طالب میں خدیجہؓ کے پاس۔"

ابوجہل نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ "یہ ہرگز نہیں ہوسکتا، بنو ہاشم کو ہم گندم کا ایک دانہ بھی نہ پہنچنے دیں گے۔"

اتفاق سے ابوالبختری بن ہشام ایک غیر مسلم رحمدل رئیس کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے پوچھا، "تم آپس میں کیوں جھگڑ رہے ہو" ابوجہل نے واقعہ بتایا اور کہا کہ "معاہدہ کے مطابق ہم کوئی چیز شعب ابی طالب میں نہیں پہنچا سکتے لیکن یہ شخص ہم سے بالا ہی بالا بنی ہاشم کو غلہ پہنچانا چاہتا ہے۔"

ابوالبختری نے کہا۔ "خدیجہؓ نے کچھ گندم اپنے بھتیجے کے پاس امانت رکھی تھی اگر وہ اسے واپس کرنا چاہتا ہے تو ہمارا اس میں کیا حرج ہے؟"

ابوجہل نے کہا۔ "تم بھی بنو ہاشم کے خیر خواہ معلوم ہوتے ہو، ہوا کرو ہمیں اس کی پرواہ نہیں لیکن میں یہ گندم شعب ابی طالب میں ہرگز نہ پہنچنے دوں گا۔"

ابوالبختری کو بھی اب جوش آگیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔ "اچھا تو پھر میں دیکھونگا کہ تم یہ گندم کیسے بنی ہاشم کو نہیں پہنچنے دیتے۔"

یہ کہہ کر اس نے ابوجہل کو پکڑ کر زمین پر دے مارا اور خوب پیٹا حتیٰ کہ وہ لہولہان ہوگیا۔ ابوالبختری کی شہ زوری کے سامنے ابوجہل کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ کان دبا کر بھاگ گیا۔ حکیم بن حزام کے غلام نے اب اطمینان کے ساتھ گندم شعب ابی طالب میں پہنچادی۔

ابوجہل کی رسوائی کا قصہ جب عام لوگوں میں پھیلا تو طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور کچھ لوگوں نے برملا محصورین سے ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا۔ بنی مخزوم کا ایک رحمدل شخص ہشام عامری، عبدالمطلب کے نواسے زہیر بن ابوامیہ کے پاس گیا اور کہنے لگا ——— "اے زہیر! تم یہ کیسے گوارا کرتے ہو کہ تم تو دونوں وقت شکم سیر ہو کر کھاؤ اور تمہارے ماموں روٹی کے ایک لقمے کو بھی ترسیں۔"

زہیر نے کہا ——— "برادرِ عم، میرے بس میں ہوتا تو میں اس ناپاک معاہدے کا قصہ کبھی کا پاک کر چکا ہوتا لیکن افسوس کہ میں اکیلا ہوں۔"

ہشام نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کمرِ ہمت باندھو ہمیں اور بھی کئی ساتھی مل جائیں گے۔"

اب زہیر اور ہشام دونوں مطعم بن عدی کے ہاں پہنچے وہاں زمعہ بن الاسود

اور ابو البختری کو بھی اپنا ہم خیال پایا۔ دوسرے دن بنو ہاشم اور بنو مطّلب کے سب خیر خواہ کعبہ میں پہنچے، قریش کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا :

"یا معشرِ قریش! کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ہم شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں لیکن بنو ہاشم اور بنو مطّلب جو ہمارے ہی بھائی بند ہیں، اناج کے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔ ان کے بچے اور عورتیں بھوک سے ہلکان ہو گئے ہیں۔ خدا کی قسم جب تک اس معاہدے کو چاک نہ کیا جائے گا ہم آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔"

ابو جہل نے فرطِ غضب میں چلّا کر کہا۔ "کسی کی مجال نہیں جو اس معاہدے کو ہاتھ لگائے۔ یہ معاہدہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک بنو ہاشم محمدؐ کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔"

زمعہ للکارا۔ "تو جھوٹ بکتا ہے ہم تو پہلے دن ہی اس معاہدہ پر راضی نہ تھے۔"

مطعم بن عدی اور ابو البختری نے ہاتھ بڑھا کر دیمک خوردہ معاہدے کو درِ کعبہ سے اتار لیا اور پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ مشرکین منہ دیکھتے رہ گئے۔

اس کے بعد زمعہ، ابو البختری، زہیر، مطعم اور ان کے دوسرے ساتھی مسلّح ہو کر شعبِ ابی طالب پہنچے اور بیکس محصورین کو وہاں سے نکال لائے۔ اس طرح تین برس کی ہولناک قید و محن کے بعد ان مظلوموں کو شہر میں رہنا نصیب ہوا۔

چند دن نہیں، چند ہفتے نہیں، چند مہینے نہیں مسلسل تین برس تک خوفناک مصائب برداشت کرنا اور جبینِ ہمت پر شکن تک نہ آنے دینا، استقامت اور عزیمت کا ایک ایسا مظاہرہ تھا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عامُ الحُزن (غم کا سال)

شعب ابی طالب کی محصوری اور سہ سالہ مقاطعہ کے خاتمے سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو اطمینان نصیب ہوا تھا وہ بہت جلد رنج و غم میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا سبب حضورؐ کے زبردست حامی و ناصر اور شفیق چچا ابوطالب اور آپ کی انتہائی وفادار اور غمگسار اہلیہ حضرت خدیجہؓ کی وفات تھی۔ یہ دونوں صدمے آپؐ کو سنہ ۱۰ بعدِ بعثت میں پیش آئے اس لیے آپؐ اس سال کو "عام الحُزن" (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضورؐ کی ان دونوں غمگسار ہستیوں کے سال وفات کے بارے میں تو تمام اہلِ سیر متفق ہیں البتہ وفات کے مہینہ اور تاریخ کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ابو طالب ۱۵ شوال سنہ ۱۰ نبوت کو فوت ہوئے اور اس کے ایک مہینہ یا پانچ دن بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے وفات پائی۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ ابوطالب شعبِ ابی طالب سے نکلنے کے چھ ماہ بعد فوت ہوئے اور ان کے صرف تین دن بعد حضرت خدیجہؓ رحلت گزینِ عالمِ جاوداں ہوئیں۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ ابوطالب شوال یا ذی القعدہ سنہ ۱۰ بعثت میں فوت ہوئے اور ان کی اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی رحلت میں ۳۵ دن کا وقفہ تھا۔

ابن قتیبہؒ، حافظ ابن عبدالبرؒ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابوطالب

اور حضرت خدیجہؓ کی وفات میں تین دن کا فصل تھا البتہ ابن جوزیؒ نے اس فصل کی مدت ۵ دن لکھی ہے۔

بعض ارباب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ام کی وفات ابو طالب سے پہلے ہوئی۔ واقدیؒ کے بیان کے مطابق وہ ابو طالب سے ۳۵ دن پہلے عالم بقا کو سدھاریں۔

قسطلانی اور بلاذریؒ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات رمضان سنہ ۱۰ نبوت میں بتائی ہے۔ بلاذریؒ نے تخصیص کے ساتھ تاریخ وفات ۱۰ رمضان لکھی ہے۔ جمہور علماء اسی بات کے قائل ہیں کہ حضرت خدیجہؓ، ابو طالب کے بعد فوت ہوئیں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ ام کی وفات نے سیدہ فاطمہؓ کو شفقت مادری سے محروم کردیا اور وہ سخت غم زدہ ہوگئیں تاہم حضورؐ اور دوسری بہنوں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور وہ اللہ کی رضا پر شاکر ہوگئیں۔

جناب ابو طالب اور ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ ام کے انتقال کے بعد مشرکین قریش کی مخالفت اور ایذا رسانی میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ سنہ ۱۰ نبوت سے سنہ ۱۳ نبوت (ہجرت مدینہ) تک کا زمانہ حضورؐ کے لیے اتنا سخت اور پُر آشوب تھا کہ اس کی تفصیل پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں کفار کے مظالم کا مقابلہ کرنا، دوسرے مظلوم مسلمانوں کی دلجوئی اور غمگساری کرنا اور دعوت حق کو مسلسل جاری رکھنا، یہ سارے کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا انجام دینے پڑتے تھے۔

بعض اہل سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مشرکین کی طرف سے حضورؐ کو جسمانی ایذائیں پہنچانے کے بیشتر واقعات اسی زمانے میں پیش آئے کیونکہ حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کے اثر و رسوخ اور اعلیٰ حیثیت کے پیش نظر

ان کی زندگی میں مشرکین کو حضورؐ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی لیکن جونہی ان دونوں ہستیوں کی آنکھیں بند ہوئیں مشرکین قریش نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا اور وہ حضورؐ کو ستانے میں شرافت اور انسانیت کی تمام حدود پھلانگ گئے تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ سنہ نبوت اور ۱۰ سنہ نبوت کے درمیانی عرصے میں بھی بعض موقعوں پر مشرکین نے حضورؐ کو کسی نہ کسی صورت میں ستانے سے گریز نہیں کیا۔ اگر حضورؐ پر بس نہیں چلا تو آپؐ کے نام لیواؤں پر ایسے ایسے ستم توڑے کہ ان کا حال پڑھ کر جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ مشرکین کی ایسی ہی ستم رانیوں سے بچنے کے لیے حضورؐ کی ایک صاحبزادی حضرت رقیہؓ (سیدہ فاطمہؓ کی بڑی بہن) آپؐ کے ایماء پر اپنے شوہر حضرت عثمانؓ بن عفان کے ساتھ حبش کو ہجرت کر گئی تھیں (۵ سنہ بعد بعثت)۔

ابن اسحاقؒ، ابن جریر طبریؒ اور ابن ہشامؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک دن (حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد) ایک بد طینت نے سر بازار حضورؐ کے سر اقدس پر مٹی (یا کیچڑ) ڈال دی۔ آپؐ اسی حالت میں گھر تشریف لائے۔ آپؐ کی ایک صاحبزادی (با ختلافِ روایت سیدہ اُمِ کلثومؓ یا سیدہ فاطمہؓ) آپؐ کا سر مبارک دھوتی جاتی تھیں اور ساتھ ہی فرطِ رنج سے روتی جاتی تھیں۔ حضورؐ ان کو تسلی دینے کے لیے یہ فرماتے جاتے تھے:—

"جانِ پدر روؤ نہیں۔ صبر کرو، اللہ تیرے باپ کا حامی ہے وہ اسے قریش کی دراز دستیوں سے مامون کر دے گا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سودہؓ سے نکاح

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے لیے یہ

مسئلہ پیدا ہو گیا کہ گھر میں سیدہ ام کلثومؓ اور سیدہ فاطمہؓ کی خبر گیری کا کیا انتظام ہو (سیدہ زینبؓ اور سیدہ رقیہؓ کی شادی حضرت خدیجہؓ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی اور وہ اپنے گھر بار والی تھیں)۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی اہلیہ حضرت خولہؓ بنت حکیم السُّلَمِیَّۃ کو حضورؐ کی پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے تحریک کی کہ حضورؐ حضرت سَودَہؓ بنت زَمعَہ سے نکاح کر لیں جو ایک سن رسیدہ قدیم الاسلام خاتون تھیں اور اپنے شوہر حضرت سکرانؓ بن عمرو کی وفات کے بعد بیوگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ حضورؐ نے حضرت خولہؓ کی تجویز سے اتفاق فرمایا اور حضرت سَودَہؓ بھی حضورؐ سے نکاح پر رضامند ہو گئیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے چند دن بعد حضرت سَودَہؓ کے والد زمعہ بن قیس نے حضورؐ کو اپنے گھر بلا کر اپنی صاحبزادی کا نکاح آپ سے کر دیا[1]۔ اکثر و بیشتر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی خاتون جن سے حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد نکاح کیا حضرت سَودَہؓ بنت زَمعَہ تھیں۔ لیکن بعض روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سَودَہؓ سے پہلے حضورؐ کا نکاح حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہو گیا تھا۔ حقیقت واقعہ کچھ بھی ہو اس بات پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جو خاتون سب سے پہلے اُمّ المؤمنین کی حیثیت سے حضورؐ کے خانۂ اقدس میں داخل ہوئیں وہ حضرت سَودَہؓ بنت زَمعَہ تھیں کیونکہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی۔

حضرت سَودَہؓ نہایت اعلیٰ اور ارفع کردار کی حامل تھیں ان سے نکاح کے بعد حضورؐ کو اپنے خانگی معاملات کی طرف سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔[2]

---

[1] ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ کے ایماء پر حضرت سَودَہؓ نے حضرت حاطبؓ بن عمرو کو اپنی طرف سے مقرر کر دیا کہ وہ ان کا نکاح حضورؐ سے کر دیں چنانچہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

حضرت حاطبؓ نے ان کا نکاح حضورؐ سے کر دیا۔

۷ ام المؤمنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ بن قیس بن عبد شمس بن عبدود عامری کا تعلق قبیلہ عامر بن لؤی سے تھا۔ والدہ کا نام شموس بنت قیس تھا جو انصار کے خاندان بنو نجار سے تھیں۔ ان کا پہلا نکاح اپنے چچا زاد بھائی سکرانؓ بن عمرو سے ہوا۔ دونوں میاں بیوی دعوتِ حق کے آغاز میں ہی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ حبشہ کی دوسری ہجرت میں دونوں نے حبش کی ہجرت اختیار کی وہاں سے چند برس کے بعد مکہ لوٹے تو حضرت سکرانؓ نے وطن پہنچ کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد حضرت سودہؓ کو امّ المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سکرانؓ کی زندگی میں ایک مرتبہ حضرت سَودہؓ نے خواب میں دیکھا کہ تکیہ کے سہارے لیٹی ہیں کہ آسمان پھٹا اور چاند ان پر گر پڑا۔ انہوں نے یہ خواب حضرت سکرانؓ سے بیان کیا تو انہوں نے کہا، اس کی تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں عنقریب فوت ہو جاؤں گا، اور تم عرب کے چاند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آؤ گی۔ یہ خواب کچھ عرصہ بعد حرف بہ حرف پورا ہو گیا۔

حضرت سودہؓ نہایت رحمدل اور کشادہ دست تھیں جو کچھ ہاتھ آتا نہایت دریا دلی سے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے سوائے سَودہؓ کے کسی عورت کو جذبۂ رقابت سے خالی نہ دیکھا۔

حضورؐ کی رحلت کے بعد حضرت سَودہؓ ساری عمر گھر سے باہر نہ نکلیں۔ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ۲۲ھ ہجری میں وفات پائی۔ حضورؐ سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی البتہ حضرت سکرانؓ کی صلب سے ایک فرزند عبدالرحمٰنؓ تھے انہوں نے جنگِ جلولا میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

رحمتِ عالم ﷺ کا سفرِ طائف

شفیق چچا اور غمگسار بیوی کی یکے بعد دیگرے رحلت نے اگرچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت ملول و محزون کر دیا اور مشرکینِ قریش بھی اپنی چیرہ دستیوں میں آپؐ پر بہت دلیر ہو گئے لیکن آپؐ راہِ حق میں اپنی تبلیغی مساعی کو کسی صورت میں ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ مکہ معظمہ سے جنوب مشرق میں تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر طائف ایک شاداب مقام ہے اور اپنی زرخیزی، باغات کی کثرت اور سرسبز چراگاہوں کی وجہ سے "عرب کی ملکہ" کہلاتا ہے۔ جب آفتابِ اسلام فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، اس وقت طائف پر بنو ثقیف کے اثر و اقتدار کا عَلَم لہرا رہا تھا۔ ان میں عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کا خاندان طائف کا حکمران تھا۔ عمرو کے تین بیٹوں عبدِ یالیل، مسعود اور حبیب نے طائف میں اپنی ریاست و امارت کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ انگور کے سرسبز باغات اور زرخیز زمینوں کی بے حساب آمدنی نے ان کا دماغ آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ نشۂ پندار میں وہ اس قدر بدمست تھے کہ کسی دوسرے کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے۔ حضورؐ نے مشرکینِ مکہ کی شدید مخالفت اور شر انگیزیوں کو دیکھ کر سوچا کہ اگر طائف کے طاقتور اور متموّل لوگ دعوتِ توحید کو قبول کر لیں تو اسلام کو زبردست تقویت حاصل ہو جائے گی اور ان لوگوں کی اعانت و حمایت سے دعوتِ حق کو نہایت تیزی سے پھیلایا جا سکے گا۔ چنانچہ ایک دن حضورؐ مکہ سے طائف کے لیے پا پیادہ روانہ ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ راستے میں آپؐ

نے قبیلہ بنو بکر اور بنو قحطان کو پیغامِ حق سنایا لیکن انہوں نے اس کے جواب میں انتہائی سرد مہری اختیار کی۔ حضورؐ اب طائف پہنچے اور تینوں ثقفی رؤساء کو دعوتِ توحید دی، وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے برہم ہو گئے۔ ان میں سے ایک (بقولِ بعض عبد یالیل) طنز آمیز لہجے میں بولا:

"خدا نے تمہیں رسول بنا کر اپنے ہاتھ سے کعبہ کا غلاف پرزے پرزے کر دیا ہے یا بروایتِ دیگر تجھے پیغمبر بنا کر خدا نے گویا خود اپنے گھر کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ میں تو کعبہ کے سامنے اپنی ڈاڑھی منڈوا ڈالوں گا اگر خدا نے تجھے اپنا پیغمبر بنایا ہو۔

ایک تیسری روایت میں اس سے یہ الفاظ بھی منسوب ہیں کہ میں کعبے کے پردے نوچ ڈالوں گا اگر اللہ نے تجھے رسالت سونپی ہے۔"

دوسرا (بقولِ بعض مسعود) تمسخر آمیز لہجے میں یوں گویا ہوا:

"کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہ ملا کہ اس کو رسول بناتا۔ تیرے پاس تو چڑھنے کے لیے سواری تک نہیں۔"

تیسرا (بقولِ بعض حبیب) منطقیانہ انداز میں کہنے لگا:

"میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا۔ اگر تم واقعی خدا کے سچے رسول ہو تو تمہاری بات جھٹلانا سخت خطرناک ہے اور خلافِ ادب بھی اور اگر تم جھوٹے ہو تو میرے شایانِ شان نہیں کہ ایک کذّاب سے گفتگو کروں۔"

حضورؐ ان کے مایوس کُن جوابات سن کر وہاں سے رخصت ہوئے تاہم چلنے سے پہلے آپؐ نے ان سے فرمایا ——— "جو تم نے کہا میں نے سن لیا مگر اس گفتگو کا چرچا نہ کیا جائے تو مناسب ہے۔"

مگران لوگوں نے خاموش رہنے کے بجائے شہر کے اوباشوں، لچوں لفنگوں اور اپنے غلاموں کو ہشکار دیا کہ وہ حق کے مقدس داعیٔ اعظمؐ کو خوب ستائیں یہاں تک کہ وہ تنگ آکر راہِ فرار اختیار کرے۔

ان شریروں کو تفننِ طبع کا ایک سامان ہاتھ آگیا۔ حضورؐ انہیں حق کی دعوت دیتے اور وہ آپؐ کو فحش گالیاں دیتے، آوازے کستے اور پتھر مارتے تھے۔ بہ اختلافِ روایت حضورؐ دس دن یا ایک ماہ تک طائف میں مقیم رہے۔ ہر روز یہی تماشا ہوتا تھا۔ محسنِ انسانیتؐ جدھر کا رُخ کرتے اشرار آپؐ کا تعاقب کرتے۔ انہوں نے شرارت، خباثت اور غنڈہ پن کی انتہا کردی۔ بدبختوں نے عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بھی یکسر فراموش کر ڈالا۔ ایسی دریدہ دہنی اور کمینہ پن سے کام لیا کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ جاں نثارِ رسول حضرت زیدؓ بن حارثہ حضورؐ کے دائیں بائیں آگے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے اور بدمعاشوں کے پتھروں کو اپنے ہاتھوں اور جسم پر روکتے تھے لیکن جب چاروں طرف سے پتھر برس رہے ہوں تو وہ کہاں تک حضورؐ کو پتھروں سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی زخمی ہو جاتے تھے اور حضورؐ کا جسمِ اطہر بھی لہولہان ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے ٹخنوں، پنڈلیوں اور گھٹنوں سے خون کے دھارے بہہ نکلتے تھے۔ ایک دن شریروں نے اتنے پتھر برسائے کہ حضرت زیدؓ بھی زخموں سے چُور چُور ہوگئے اور حضورؐ بھی مجروح و نزار ہو کر زمین پر گر پڑے۔ جسمِ اقدس کے ہر حصے سے خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ شریروں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا اور پھر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار ساتھی کے ہمراہ زخموں سے چُور چُور اور خون میں غلطیدہ طائف سے نکلے اوباشوں نے دور تک تعاقب جاری رکھا۔ طائف کے باہر انگوروں کا ایک باغ تھا جس کے

مالک مکہ کے دو قریشی رئیس عتبہ اور شیبہ فرزندان ربیعہ تھے۔ حضورؐ اس باغ کے احاطہ میں داخل ہو گئے۔ اور انگوروں کی بیلوں کی آڑ میں پناہ لی۔ شریر اب تھک کر واپس چلے گئے۔ عتبہ اور شیبہ نے دور سے ان زخمی اور خستہ حال مسافروں کو دیکھا تو انہوں نے اپنے غلام عداس کو حکم دیا کہ جاؤ انگوروں کا ایک خوشہ ان مسافروں کو دے آؤ، انہوں نے ہمارے باغ میں پناہ لی ہے۔ عداس نے جلدی جلدی کچھ پکے ہوئے انگور چُنے اور ایک طباق میں رکھ کر مقدس مسافروں کی طرف چلا۔ اس وقت حضورؐ فرطِ نقاہت سے لیٹے ہوئے تھے، حضرت زیدؓ اپنی چادر سے محبوب خدا کے جسمِ مبارک سے خون صاف کر رہے تھے۔ نعلین مبارک میں اتنا خون جم گیا تھا کہ حضورؐ بصد مشکل اپنے پاؤں ان سے باہر نکال سکے۔ قریب ہی پانی موجود تھا حضورؐ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے۔ وضو کیا اور بارگاہِ ربّ العزت میں یہ دعا مانگی:

"الٰہی میں اپنے ضعف اور بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی تحقیر اور بے سر و سامانی کی فریاد تیرے ہی حضور کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین اے درماندہ ناتوانوں کے مالک تو ہی میرا ربّ ہے۔ اے میرے آقا تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ کسی بیگانے کے پاس جو ترش رو ہوگا یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پالینے کی طاقت دے دی ہے۔ لیکن جب تو مجھ سے ناخوش نہیں ہے تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے۔ کیونکہ تیری عافیت اور بخشش میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذاتِ پاک کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے آسمان روشن ہوئے اور جس سے تاریکیاں دور ہوئیں اور دنیا و آخرت کے کام ٹھیک ہوئے۔ تجھ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر غضب نازل کرے یا تیری ناخوشی مجھ پر وارد ہو۔ عتاب کرنے کا تجھی کو حق

ہے۔ میں تیری مرضی پہ راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیری مدد اور تائید کے بغیر کسی کو کوئی قدرت نہیں۔"

اتنے میں عداس نے انگوروں کا طباق آپ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ انہیں کھالیں۔ حضورؐ نے بسم اللہ (بروایت دیگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کہہ کر انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عداس نے حیران ہو کر کہا "خدا کی قسم اس سرزمین کے باشندوں سے تو میں نے کبھی ایسی بات نہیں سنی۔"

حضورؐ نے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو اور کس دین کے پیرو ہو۔"

عداس نے جواب دیا، "میں ارضِ نینوی کا رہنے والا ہوں اور دینِ مسیحی کا پیرو ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا "اچھا تو تم مردِ صالح یونسؑ بن متّیٰ کے ہم وطن ہو۔"

عداس نے پوچھا "آپ یونسؑ بن متّیٰ کو کیسے جانتے ہیں؟"

فرمایا، "وہ میرے بھائی ہیں وہ بھی خدا کے نبی تھے اور میں بھی خدا کا نبی ہوں۔"

عداس میں اب تابِ ضبط نہ رہی فوراً رحمتِ عالمؐ کے قدموں پر گر پڑا اور پھر والہانہ آپؐ کے سرِ اقدس اور ہاتھوں کو چومتے ہوئے پکار اٹھا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔"

عتبہ اور شیبہ دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے جب عداس ان کے پاس لوٹ کر گیا تو انہوں نے کہا "یہ تجھے کیا ہو گیا کہ تو اس مسافر کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔"

عداس نے جواب دیا "صاحبو آج روئے زمین پر اس مسافر سے بڑھ کر عظیم کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس نے مجھے ایک ایسی چیز کی خبر دی جو ایک نبی کے سوا

کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔"

دونوں بھائیوں نے عداسؓ کو ڈانٹ پلائی کہ خبردار اپنا دین مت چھوڑنا تیرا دین اس مسافر کے دین سے بہتر ہے۔

یہاں سے مراجعت فرما کر حضورؐ نخلہ پہنچے اور کچھ دن وہاں قیام فرمانے کے بعد مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کر کے مکہ تشریف لے گئے۔ طائف سے رخصت ہوتے وقت حضورؐ نے فرمایا:۔

"میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے بد دعا نہیں کرنا چاہتا، مجھے اپنے اللہ کے کرم سے امید ہے کہ وہ انہیں ہدایت دے گا اور ان کی آئندہ نسلیں خدائے واحد کی پرستار ہوں گی۔"

حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ طائف سے واپسی کا دن میری زندگی کا سخت ترین دن تھا حتٰی کہ احد کے دن سے بھی سخت۔ جبریلؑ نے اس دن مجھ سے پوچھا کہ اگر آپ چاہیں تو طائف کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دوں۔ (مکہ کے دو طرفہ پہاڑوں ابوقبیس اور قعیقعان کو اس پر الٹ دوں) لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "مجھے امید ہے اللہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ واپس تشریف لائے تو خستگی اور زخموں کی وجہ سے نڈھال تھے۔ سیدہ فاطمہؓ پدر گرامیؐ کا حال دیکھ کر سخت مضطرب ہوئیں اور کئی دن تک بڑی تن دہی کے ساتھ حضورؐ کی خدمت گزاری میں مصروف رہیں۔ سیدہ اُمّ کلثومؓ بھی اس کام میں چھوٹی بہن کی شریک تھیں۔ دونوں بہنوں کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک حضورؐ کے زخم مندمل نہ ہو گئے اور آپؐ کی صحت بحال نہ ہو گئی۔

ہجرت

طائف سے واپسی کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے تبلیغ حق کا کام پھر پوری سرگرمی سے شروع کر دیا۔ اس سال (سنہ ۱۱ نبوت میں) مدینہ سے جو لوگ حج کے لیے آئے ان میں سے قبیلہ خزرج کے چھ سلیم الطبع آدمی حضورؐ کی دعوت سے متاثر ہو گئے اور مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ واپس گئے۔ دوسرے سال حج کے موقع پر مدینہ کے بارہ آدمیوں نے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ تیسرے سال مدینہ سے ۷۳ مردوں اور دو عورتوں کی ایک جماعت نے مکہ پہنچ کر اس عہد کے ساتھ آپؐ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی کہ آپ مدینہ تشریف لائیں تو ہم اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپ کی حمایت و حفاظت کریں گے۔ یہ بیعت "بیعت عقبۂ کبیرہ" کہلاتی ہے۔ اس بیعت (ذی الحجہ ۱۳ بعد بعثت) کے بعد حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ معدودے چند صحابہ کے سوا تمام صحابۂ کرامؓ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد خود ذاتِ رسالت مآبؐ بھی ایک رات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے بسترِ مبارک پر سلا کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں عازمِ مدینہ ہوئے۔ حضورؐ کی ہجرتِ مدینہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہم بالشان واقعہ ہے۔ مختصر یہ کہ مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے کے بعد جب حضورؐ نے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کا آغاز فرمایا تو حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حکم دیا کہ وہ مکے جا کر وہاں سے آپؐ کے اہل و عیال اور متعلقین کو مدینہ منورہ لے آئیں (بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ

نے حضرت زیدؓ کے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافعؓ کو بھی اس مقصد کے لیے مکہ بھیجا[۱]) حضورؐ نے انہیں ۵ سو درہم اور دو کوتل اونٹ دیئے۔ ان کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی عبداللہ بن اُریقط کو اپنے صاحبزادے عبداللہؓ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچ جائیں۔

چنانچہ حضرت زیدؓ بن حارثہ، اُمّ المومنین حضرت سودہؓ، حضورؐ کی دو صاحبزادیوں حضرت اُمّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ، اپنی بیوی حضرت اُمّ ایمنؓ اور اپنے صاحبزادے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو مکہ سے مدینہ لے آئے۔ حضرت عبداللہؓ بن ابی بکرؓ انہی لوگوں کے ساتھ حضرت اُمّ رومانؓ (اہلیہ صدیق اکبرؓ)، حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کو مدینہ لے آئے۔ حضورؐ کے اہل وعیال مسجد نبوی کے ملحقہ حجروں میں فروکش ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اہل وعیال نے بنو حارث بن خزرج کے محلہ میں حضرت حارثہؓ بن نعمان کے مکان میں قیام کیا۔

شیعہ مؤرخ محسن امین العاملی نے "اعیان الشیعہ" میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ہجرت کا واقعہ اس طریقے سے بیان کیا ہے کہ حضورؐ کی ہجرت کے بعد دوسرے دن حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے لوگوں کی امانتیں ان کو واپس کیں اور پھر اپنی

---

۱ اگرچہ کئی ثقہ اہلِ سیر نے اس سلسلہ میں حضرت ابورافعؓ کا نام لیا ہے لیکن انہوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ حضرت ابورافعؓ اس وقت مدینہ کیسے پہنچ گئے تھے۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابورافعؓ بدر کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ جبکہ حضورؐ کے اہل وعیال بدر سے پہلے مدینہ پہنچے۔ ابنِ سعدؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضورؐ نے ابورافعؓ کو حضرت عباسؓ کے قبولِ اسلام کی مسرت میں آزاد کیا۔ مستند روایات کے مطابق حضرت عباسؓ نے غزوۂ خیبر کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے علانیہ اسلام قبول کیا اس لیے بعض اہلِ سیر کا یہ لکھنا کہ حضرت زیدؓ کے ساتھ حضورؐ کے آزاد کردہ غلام" ابورافعؓ بھی مکے گئے، محلِ نظر ہے۔

والدہ فاطمہؓ بنت اسد اور خاندان کی دوسری خواتین حضرت فاطمہ زہراؑ، فاطمہؓ بنت زبیر بن عبدالمطّلب اور فاطمہ بنت حمزہؓ کو ساتھ لے کر اونٹوں پر عازم مدینہ ہوئے۔ ہم نام خواتین کو ساتھ لینے کا مطلب یہ تھا کہ بنتِ رسول اللہؐ دشمن کی زد سے بچ جائیں۔ قریش کے کچھ سواروں نے اس قافلے کا تعاقب کیا اور ضجنان کے مقام پر اس کو روک لیا لیکن شیرِ خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو مار بھگایا اور سارا قافلہ خیر و عافیت کے ساتھ حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں قبا پہنچ گیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھائی کو خوش آمدید کہا، بیٹی کو گلے لگایا اور سب کو ساتھ لے کر مدینے میں داخل ہوئے۔

اس روایت کے مطابق حضرت فاطمۃ الزہراءؓ حضورؐ کے خاص مدینہ منورہ میں داخلے سے پہلے ہی آپؐ کی خدمت میں پہنچ گئی تھیں لیکن جمہور اربابِ سیر کا اسی روایت پر اتفاق ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے۔
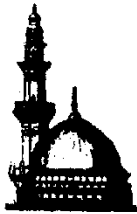
شادی

ہجرتِ مدینہ کے وقت سیّدہ فاطمۃ الزہراؑ سنِ بلوغت کو پہنچ چکی تھیں۔
ایک روایت کے مطابق ان کے ورودِ مدینہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہؓ سے عقد کرنے کی درخواست کی۔ حضورؐ خاموش رہے یا بعض روایتوں کے مطابق فرمایا ـــــ "ابوبکر حکمِ الٰہی کا انتظار کرو۔" (علامہ بلاذری نے حضورؐ سے یہ الفاظ منسوب کیے ہیں "اس سلسلہ میں مجھے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا انتظار ہے۔") اس کے بعد حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت فاطمہؓ کے لیے پیغام بھیجا۔ حضورؐ نے انہیں بھی یہی جواب دیا[1] چند دن بعد حضورؐ نے سیّدہ فاطمۃ الزہراؑ کی نسبت شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے کر دی۔ یہ نسبت کیسے قرار پائی اس کے متعلق تین مشہور روایتیں یہ ہیں۔

پہلی روایت یہ ہے کہ ایک دن حضرات ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص نے مشورہ کیا کہ فاطمہؓ کے لیے کئی پیغام حضورؐ کو پہنچے ہیں لیکن آپؐ نے کوئی بھی منظور نہیں فرمایا۔ اب علیؓ باقی ہیں جو رسول اللہ کے جاں نثار اور محبوب بھی ہیں اور عم زاد بھی، معلوم ہوتا ہے فقر و تنگدستی کی وجہ سے وہ

---

[1] بعض سیرت نگاروں نے اس روایت پر تنقید کی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ حافظ ابنِ حجرؒ نے "اصابہ" میں ابنِ سعدؒ کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہؓ کے ترجمہ میں روایت کی ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

فاطمہؓ کے لیے پیغام نہیں دیتے۔ کیوں نہ انہیں پیغام بھیجنے کی ترغیب دی جائے
اور ضرورت ہو تو ان کی مدد بھی کی جائے۔ تینوں حضرات یہ مشورہ کرکے حضرت
علیؓ کو ڈھونڈنے نکلے، وہ جنگل میں اپنا اونٹ چرا رہے تھے تینوں بزرگوں نے بڑے خلوص
کے ساتھ حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ کے لیے پیغام بھیجنے کی ترغیب دی
انہیں اپنی بے سروسامانی کی بنا پر ایسا کرنے میں تامل ہوا مگر ان حضراتؓ
کے مجبور کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ دلی خواہش تو ان کی بھی یہی تھی لیکن فطری
حیا پیغام بھیجنے میں مانع تھی، اب جرأت کرکے حضورؐ کو پیغام بھیج دیا۔ حضورؐ
نے ان کی استدعا فوراً قبول فرمالی۔ پھر حضورؐ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے
اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بزبانِ خاموشی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا لہ۔

دوسری روایت یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کی ایک جماعت نے حضرت
علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت فاطمہؓ کے لیے پیغام بھیجنے کی ترغیب دی ۲ حضرت علیؓ

لہ مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ "حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ آپؐ جب اپنی کسی صاحبزادی
کا عقد کرنا چاہتے تو ان کے پاس تشریف لے جاتے اور بلند آواز سے فرماتے "فلاں شخص
نے تمہارے لیے نکاح کا پیغام دیا ہے۔" اس ارشاد کے جواب میں اگر وہ خاموش رہتیں
تو آپؐ سمجھ لیتے کہ لڑکی رضامند ہے۔" حضرت فاطمہؓ کی رضامندی بھی آپؐ نے
اسی طرح معلوم کی۔ اسی بنا پر فقہاء نے فرمایا ہے کہ جب ولی بالغہ لڑکی کا نکاح کرنا چاہے
تو اس سے اجازت لے اور حسبِ ارشادِ نبویؐ کنواری لڑکی کا سکوت ہی بمنزلہ رضامندی
یا اجازت کے ہوتا ہے۔

۲ بعض روایتوں میں صرف انصار کا ذکر ہے اور بعض میں انصار کے ساتھ مہاجرین کا ہونا
بھی بیان کیا گیا ہے البتہ بعض اہلِ سیر نے یہ تخصیص کی ہے کہ یہ مہاجرین بنو ہاشم سے
تعلق رکھتے تھے۔

حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حرف مدعا زبان پر لائے۔ حضورؐ نے فوراً فرمایا اھلاً و مرحبا اور پھر خاموش ہو گئے۔ صحابہؓ کی جماعت باہر منتظر تھی۔ حضرت علیؓ نے انہیں حضورؐ کا جواب سنایا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کو مبارکباد دی کہ حضورؐ نے آپ کا پیغام منظور فرمالیا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی ایک آزاد کردہ لونڈی نے ایک دن ان سے پوچھا:

"کیا فاطمہؓ کا پیغام حضورؐ کو کسی نے بھیجا؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں۔"

اس نے کہا۔ "آپ کیوں پیغام نہیں بھیجتے؟"

علی المرتضیٰؓ نے فرمایا۔ "میرے پاس کیا چیز ہے کہ میں عقد کروں۔"

اس نیک بخت نے حضرت علی مرتضیٰؓ کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے تو کچھ حضورؐ کی جلالت اور کچھ فطری حیا کہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے اور سر جھکا کر خاموش بیٹھ رہے۔

حضورؐ نے خود ہی توجہ فرمائی اور پوچھا:

"علی آج خلافِ معمول بالکل ہی چُپ چاپ ہو، کیا فاطمہ سے نکاح کی درخواست لے کر آئے ہو؟"

حضرت علیؓ نے عرض کیا "بے شک یا رسول اللہ"

حضورؐ نے پوچھا "تمہارے پاس حقِ مہر ادا کرنے کے لیے بھی کچھ ہے؟"[1]

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے حضرت علیؓ کی درخواست قبول فرمائی اور اس واقعہ کے چند دن بعد انہیں بلا کر یہ استفسار فرمایا۔

حضرت علیؓ نے عرض کیا، "ایک زرہ اور ایک گھوڑے کے سوا کچھ نہیں۔"[1]
حضورؐ نے فرمایا، "گھوڑا تو لڑائی کے لیے ضروری ہے۔ زرہ کو فروخت کر کے اس کی قیمت لے آؤ۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشادِ نبویؐ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے یہ زرہ فروخت کے لیے صحابہؓ کے سامنے پیش کی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے ۴۸۰ درہم پر یہ زرہ خرید لی اور پھر ہدیتہً حضرت علیؓ کو واپس دے دی۔ حضرت علیؓ یہ رقم لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا تو آپؐ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں دعائے خیر کی۔ اسی اثناء میں حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کی رضامندی حاصل کر لی تھی۔ حضرت علیؓ نے زرہ کی قیمتِ فروخت حضورؐ کی خدمت میں پیش کی تو آپؐ نے فرمایا: "دو تہائی خوشبو وغیرہ پر صرف کر دو اور ایک تہائی سامانِ شادی اور دیگر اشیائے خانہ داری پر خرچ کرو۔"[2] پھر حضورؐ نے حضرت انسؓ بن مالک کو حکم دیا کہ جاؤ ابوبکرؓ، عمرؓ، طلحہؓ،

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حضرت علیؓ نے حضورؐ کے سوال کا جواب نفی میں دیا اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کے پاس نقد کچھ بھی نہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "وہ حُطمی زرہ کیا ہوئی جو میں نے تمہیں فلاں موقع پر دی تھی؟" (ایک روایت کے مطابق یہ زرہ حضرت علیؓ کو غزوۂ بدر میں حاصل ہوئی تھی) حضرت علیؓ نے عرض کیا "وہ تو میرے پاس موجود ہے۔"
حضورؐ نے فرمایا "اسی کو فروخت کر کے مہر دے دو۔" طبقات ابن سعد اور تاریخ الخمیس میں ہے کہ یہ زرہ بنو عبدالقیس کے ایک بطن حُطمہ بن محارب سے منسوب تھی۔ بڑی عریض اور ثقیل زرہ تھی جس پر تلواریں ٹوٹ جاتی تھیں۔

[2] ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس میں سے کچھ رقم حضرت بلالؓ کو خوشبو وغیرہ
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور دیگر مہاجرین وانصار کو مسجدِ نبوی میں بلا لاؤ۔ (خود حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ اس سے پہلے حضورؐ پر وحی آنے کی سی کیفیت طاری ہوئی وہ کیفیت دور ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ جبریلِ امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لائے تھے کہ فاطمہؓ کا نکاح علیؓ سے کر دیا جائے)

جب بہت سے صحابۂ کرامؓ دربارِ رسالت (مسجدِ نبوی) میں جمع ہو گئے تو حضورؐ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"اے گروہِ مہاجرین وانصار مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ فاطمہ بنت محمدؐ کا نکاح علی بن ابی طالب سے کردوں۔ میں تمہارے سامنے اسی حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔"

اس کے بعد آپؐ نے یہ خطبۂ نکاح پڑھا:

الحمد للہ المحمود بنعمتہ المعبود بقدرتہ المطاع بسلطانہ المرھوب من عذابہ المرغوب الیہ فیما عندہ النافذ امرہ فی سمائہ وارضہ الذی خلق الخلق بقدرتہ ومیزھم بحکمتہ واحکمھم بعزتہ واعزھم بدینہ واکرمھم بنبیہ محمد ثم ان اللہ تعالیٰ جعل المصاھرۃ نسباً لاحقاً وامراً مفترضاً وشج بھا الارحام والزمھا الانام فقال عزوجل وھوالذی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لانے کے لیے دی اور باقی رقم حضرت انسؓ کی والدہ حضرت اُمِ سُلیمؓ کے سپرد کر دی کہ وہ سیدہ کی رخصتی کا انتظام کریں۔ (مدارج النبوۃ) اس سلسلہ کی ایک دوسری روایت میں حضرت اُمِ سُلیمؓ کی جگہ حضرت اُمِ سلمہؓ کا نام آیا ہے۔

خلق من الماء بشراً فجعله نسباً و صهراً و کان ربک قدیراً فامر الله یجری الیٰ قضائه و قضاءهٗ یجری الیٰ قدره و قدرهٗ یجری الیٰ اجله فلکل قضاءٍ ولکل قدرٍ اجلٌ و لکلّ اجلٍ کتابٌ یمحوا الله مَا یشاء ویُثبتُ وعندهٗ اُمّ الکتاب۔

مطالب : "اللہ کا شکر ہے جو اپنی نعمتوں کے باعث ہر تعریف و تحسین کا سزاوار ہے اور اپنی قدرتوں کی وجہ سے عبادت کے لائق ہے اس کا اقتدار ہر جگہ قائم ہے اس کا حکم زمین و آسمان پر نافذ ہے۔ اس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے بنایا اپنے احکام کے ذریعے انہیں آپس میں الگ الگ کیا انہیں اپنے دین کے ذریعے سے عزت بخشی اور اپنے نبیؐ کے ذریعے سے عظمت و سربلندی سے بہرہ ور کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے شادی بیاہ کو ایک لازم امر قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے" وہی ذاتِ پاک ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا اور بعض کو بعض کا بیٹا بیٹی اور داماد بنایا اور تیرا رب ہر چیز پر قادر ہے" اللہ نے ہر کام کو اپنی قضا و قدر کے تحت کر دیا ہے اور قضا و قدر کا ایک وقت مقرر ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ہی پوری ہوتی ہے اور ہر اجل کے لیے کتاب ہے۔"

خطبہ کے بعد حضورؐ نے حضرت علی مرتضیٰؑ سے متبسم ہو کر فرمایا: "میں نے چار سو مثقال چاندی کے مہر پر فاطمہ کو تیرے نکاح میں دیا۔ کیا تجھے منظور ہے۔" [۱]

---

[۱] بعض روایتوں میں مہر کی رقم پانچ سو درہم اور بعض میں ۴۸۰ درہم بھی بیان کی گئی ہے۔

حضرت علیؑ نے کہا "بسر و چشم" [1]

پھر حضورؐ نے بدیں الفاظ دعا کی:

"جمع اللّٰہ شملکما و اسعد جدکما و بارک علیکما و اخرج منکما ذریۃً طیبۃً۔"

(اللہ تعالیٰ تم دونوں کی پراگندگی کو جمع کرے، تمہاری کوششوں کو سعید بنائے، تم پر برکت کرے اور تم سے پاک اولاد پیدا کرے۔)

پھر سب نے مل کر دعائے خیر و برکت مانگی اور ایک طبق کھجوریں حاضرین پر لٹائی گئیں۔ بقولِ بعض اس موقع پر حاضرین کو شہد کا شربت اور کھجوریں تقسیم کی گئیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر چھوہارے تقسیم فرمائے۔ اسی بناء پر بعض فقہاء نے نکاح کے وقت چھوہارے یا بادام یا شکر کا لٹانا مستحب قرار دیا ہے۔

تاریخ نکاح کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ مبارک نکاح رمضان المبارک یا ذوالقعدہ یا ذوالحجہ یا صفر ۲ھ ہجری میں اور بعض کے نزدیک رجب ۲ھ ہجری میں ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق شوال ۳ھ ہجری میں نکاح ہوا۔ کچھ مؤرخین کا قول ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح جنگِ اُحد کے بعد اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی کے ساڑھے چار یا ساڑھے پانچ ماہ بعد ہوا۔ اربابِ سیر میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ یہ مبارک

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ ایجاب و قبول کے بعد حضرت علیؓ سجدۂ شکر میں گر گئے اور یہ دعا مانگی کہ "الٰہی مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو مجھے عطا فرمائی اور میرے باپ کو بخشی ہے اور میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ الٰہی میری ذریت کو صالح قرار دے۔" اس پر حضورؐ نے آمین فرمایا۔

تقریب غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احد سے پہلے منعقد ہوئی۔

سیدہ کی رخصتی کے بارے میں بھی اہل سیر میں اختلاف ہے بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح کے فوراً بعد رخصتی عمل میں آگئی۔ بعض نے لکھا ہے کہ ایک ماہ بعد رخصتی ہوئی اور بعض کا قول ہے کہ حضرت علیؓ نے نکاح کے ساڑھے سات مہینے یا ساڑھے نو مہینے بعد حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کرائی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نکاح غزوۂ بدر کے بعد ہوا اور رخصتانہ غزوۂ احد کے بعد ہوا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

رخصتی کے دوسرے دن حضورؐ نے خواہش ظاہر کی کہ ولیمہ بھی ہونا چاہیے۔ حضرت سعدؓ نے اس مقصد کے لیے فوراً ایک بھیڑ ہدیتہً پیش کر دی، اور کچھ انصار نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ حضرت علیؓ نے مہر میں سے جو رقم بچ رہی تھی اس سے کچھ اشیاء خریدیں۔ دعوتِ ولیمہ میں دسترخوان پر کھجور، پنیر، نانِ جو اور گوشت تھا۔ حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ یہ اس زمانے کا بہترین ولیمہ تھا۔

جو اصحاب نکاح کے کچھ عرصہ بعد رخصتی کے قائل ہیں انہوں نے اس سلسلے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے سرورِ کائناتؐ کے کاشانۂ اقدس سے کچھ فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ ایک دن حضرت علیؓ کے بھائی عقیلؓ بن ابی طالب ان کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں رسولِ کریمؐ اپنی لختِ جگر کو اب رخصت کر دیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا، میری بھی یہی خواہش ہے۔ چنانچہ دونوں حضرات حضرت اُمِّ ایمنؓ کے پاس تشریف لے گئے جو حضورؐ کی آزاد کردہ کنیز تھیں اور جنھوں نے حضورؐ کے بچپن میں آپؐ کی خبرگیری اور خدمت کی تھی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بے حد تعظیم و توقیر فرماتے تھے اور "میری ماں" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ حضرت اُمِّ ایمنؓ ان دونوں

کو ازواجِ مطہراتؓ کے پاس لے گئیں انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا: "یا رسول اللہ علیؓ کی خواہش ہے کہ ان کی بیوی کو رخصت کر دیجئے۔" حضور رسالت مآبؐ راضی ہو گئے۔ چند درہم حضرت علیؓ کو دیئے اور فرمایا "جاؤ بازار سے چھوہارے اور پنیر خرید لاؤ۔" حضرت علیؓ نے پانچ درہم کا گھی خریدا، ایک درہم کا پنیر اور چار درہم کے چھوہارے اور سب اشیاء لا کر حضورؐ کے سامنے رکھ دیں۔ حضورؐ نے ان چیزوں کو دعوتِ ولیمہ کے لیے رکھ دیا۔ پھر آپؐ نے حضرت فاطمۃ الزہراؑ کو بلایا، اپنے سینۂ مبارک پر ان کا سر رکھا، پیشانی پر بوسہ دیا اور ان کا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

"اے علی پیغمبر کی بیٹی تجھے مبارک ہو۔"

اور ـــ "اے فاطمہ تیرا شوہر بہت اچھا ہے اب تم دونوں میاں بیوی اپنے گھر جاؤ۔"

پھر دونوں کو میاں بیوی کے فرائض و حقوق بتلائے اور خود دروازے تک وداع کرنے آئے۔ دروازے پر حضرت علی مرتضیٰؓ کے دونوں بازو پکڑ کر انہیں دعائے خیر و برکت دی۔ حضرت علیؓ اور سیدۃ النساءؓ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کی نکیل پکڑی۔ حضرت اسماءؓ بنت عمیس اور بعض روایتوں کے مطابق سلمیٰؓ اُمِّ رافع یا حضرت اُمِّ ایمنؓ سیدہؓ کے ہمراہ گئیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لختِ جگر کو جو جہیز دیا مختلف روایتوں کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ایک بستر مصری کپڑے کا، جس میں اون بھری ہوئی تھی۔
۲۔ ایک نقشی تخت یا پلنگ۔

۳ - ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔
۴ - ایک مشکیزہ۔
۵ - دو مٹی کے برتن (یا گھڑے) پانی کے لیے۔
۶ - ایک چکی (ایک روایت میں ۲ چکیاں درج ہیں)
۷ - ایک پیالہ
۸ - دو چادریں
۹ - دو بازو بند نقرئی
۱۰ - ایک جا نماز

حضرت فاطمہؑ کی رخصتی کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؑ کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام فرمایا۔ آپؐ نے جو اشیاء اس مقصد کے لیے منگوائی تھیں ان سب کا مالیدہ تیار کرنے کا حکم دیا اور پھر حضرت علیؑ سے فرمایا کہ باہر جا کر جو مسلمان بھی ملے اسے اندر لے آؤ۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین و انصار کو اس بابرکت دعوت میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جب مہمانوں نے کھانا کھا لیا تو آپؐ نے ایک پیالہ کھانا حضرت علیؑ کو اور ایک سیدہ فاطمۃ الزہراءؑ کو مرحمت فرمایا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ انصاری سے روایت ہے کہ میں علیؑ و فاطمہؑ کی دعوتِ ولیمہ میں حاضر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس سے بہتر اور عمدہ دعوتِ ولیمہ کسی کی نہیں دیکھی۔ رسول اللہؐ نے ہمارے لیے گوشت اور چھوہارے سے کھانا تیار کرایا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو آپؐ نے مدینہ کے لوگوں کو بلا بھیجا اور اپنے دستِ مبارک سے مہمانوں میں تقسیم فرمایا۔

اس سلسلہ کی کچھ اور روایتیں

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ علیؑ اور فاطمہؑ کے عقد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم (امہات المومنین) کو حکم دیا کہ فاطمہؑ کے لیے جہیز تیار کریں اور ان کو علیؑ کے پاس پہنچا دیں۔ فاطمہؑ کے لیے ایک علیحدہ حجرہ تجویز کیا گیا۔ پھر میدانِ بطحاء کے کنارے سے نرم مٹی منگوا کر ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس حجرے میں بچھائی اور فرش تیار کیا۔ پھر ہم نے خرما کی چھال اپنے ہاتھ سے توم کر دو تکیے تیار کیے اور حجرہ کے ایک کونے میں کپڑے اور مشک لٹکانے کے لیے ایک لکڑی گاڑ دی۔ پھر فاطمہؑ کو اس حجرے میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد دعوت ولیمہ پر ہم نے لوگوں کو کھجوریں اور انگور کھلائے۔ پس ہم نے فاطمہؑ کی شادی سے بہتر کوئی شادی نہیں دیکھی۔ (ابن ماجہ)

ایک روایت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ بیان منسوب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو یہ تین چیزیں جہیز میں دیں، سیاہ رنگ کی ایک چادر، ایک مشک اور ایک تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔ (مسند نسائی)

مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدہ فاطمہؑ کے جہیز میں ایک مشک، ایک چکّی اور ایک مخطّط کملی بھی دی تھی۔

جب حضرت فاطمۃ الزہراءؑ رخصت ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئیں

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوکر اجازت مانگی پھر اندر داخل ہوئے۔ ایک برتن میں پانی منگوایا دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علیؓ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا پھر سیّدہ فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ شرم وحیا سے جھجکتی ہوئی حضورؐ کے سامنے آئیں۔ آپؐ نے ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا:

"اے فاطمہ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان میں بہترین شخص سے کی ہے۔" (طبقات ابنِ سعد)

آپؐ نے پانی چھڑکتے ہوئے یہ بھی فرمایا، الٰہی میں ان دونوں کو اور ان کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔

(حصنِ حصین بحوالہ ابنِ حبّان)

اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی ملتی ہیں جن میں واقعات کسی قدر مختلف پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان روایتوں میں سے بھی کچھ بیان کردی جائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب سیدہ فاطمہؓ حضورؐ سے رخصت ہوکر شوہر کے گھر جانے لگیں تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ میرے منتظر رہنا۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ اپنے گھر جاکر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور حضورؐ کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے دروازے پر تشریف لائے اور اندر آنے کی اجازت طلب فرمائی۔ حضرت اُمِ ایمنؓ دروازہ کھولنے آئیں تو ان کے اور حضورؐ کے مابین یہ گفتگو ہوئی:

رسولِ اکرمؐ :۔ کیا میرا بھائی اس مکان میں ہے؟

حضرت اُمِ ایمنؓ :۔ یارسول اللہ وہ آپؐ کے بھائی کیسے ہوئے آپؐ نے تو

اپنی صاحبزادی کا عقد ان سے کیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ :- ہاں یہ بات جائز ہے —— کیا اس جگہ اسماءؓ بنتِ عمیس بھی ہیں اور کیا آپ بنتِ رسولؐ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئی ہیں۔

حضرت اُمِّ ایمنؓ :- جی ہاں، اسماءؓ بنتِ عمیس بھی ہیں اور میں اور وہ بنتِ رسول اللہؐ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئی ہیں۔

حضورؐ نے حضرت اُمِّ ایمنؓ کو دعائے خیر دی پھر اندر تشریف لے گئے اور پانی طلب فرمایا۔ ایک لکڑی کے پیالے (یا کسی اور برتن) میں پانی پیش کیا گیا، آپؐ نے اس کو جھوٹا کر کے (یا اس میں اپنے دستِ مبارک ڈال کر) اور اس پر جو کچھ اللہ نے چاہا پڑھ کر حضرت علیؓ کو سامنے بلایا اور ان کے دونوں شانوں، بازوؤں اور سینہ پر وہ پانی چھڑک دیا پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا وہ شرماتی ہوئی سامنے آئیں تو ان پر بھی پانی چھڑک کر فرمایا کہ اے فاطمہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔

(ابنِ سعد و طبرانی)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ رخصتی کے بعد اپنے گھر پہنچیں تو حضورؐ حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ ایک برتن میں پانی طلب فرمایا اور وضو کیا پھر پانی پر کچھ دعائیں پڑھیں اور وہ پانی سیدہ فاطمہؓ کے سر و سینہ اور حضرت علیؓ کے سر اور بازوؤں پر چھڑکا اور فرمایا:

"الٰہی یہ دونوں مجھے دنیا میں سب سے عزیز ہیں تو بھی ان کو دوست رکھ اور ان کی نسل میں برکت عطا فرما اور اپنی طرف سے ان کی حفاظت فرما۔"[1] (کنز العمال و ابنِ عساکر)

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر قرآنِ کریم کی آخری تین سورتیں پڑھ کر حضرت علیؓ پر دم کیا۔ ایک اور روایت میں صرف دو سورتوں (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کے پڑھنے کا ذکر ہے۔

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے بعد حضورؐ ان کے گھر تشریف لے گئے اور پانی منگوا کر اس سے وضو کیا اور پھر اسے حضرت علیؓ پر ڈال کر یہ دعا کی:

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِمَا وَبَارِكْ لَهُمَا فِيْ بِنَائِهِمَا۔

(اے اللہ ان دونوں کے اسبابِ معیشت میں برکت دے اور دونوں کے خاص تعلق کے بارے میں برکت نازل فرما)

بعض روایتوں میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ایک برتن میں پانی لے کر اس میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھ کر دعا کی پھر حضرت علیؓ سے فرمایا کہ پانی پی کر وضو کر لو۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کو بھی پانی پی کر وضو کرنے کی ہدایت فرمائی۔ جب دونوں تعمیلِ ارشاد کر چکے تو حضورؐ نے دُعا کی:

"الٰہی یہ دونوں میرے ہیں اور میں ان کا ہوں جس طرح تو نے مجھ کو پاک کر دیا ہے اسی طرح ان دونوں کو بھی پاک کر دے۔"

پھر آپؐ نے انہیں آرام کرنے کی اجازت دی اور دوبارہ دعا کی:

"الٰہی ان میں محبت پیدا کر، انہیں اور ان کی اولاد کو برکت دے، ان کو اطمینان عطا کر، ان کو خوش نصیب بنا دے، ان پر برکت نازل کر، ان کی نسل کو ترقی اور پاکیزگی عطا فرما۔"

نیا گھر

سیدہ فاطمۃ الزہرا رض میکے سے رخصت ہو کر جس گھر میں گئیں — وہ مسکنِ نبوی ص سے کسی قدر فاصلے پر تھا۔ حضور ص کو وہاں آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن آپ ص نے حضرت فاطمہ رض سے فرمایا :

"بیٹی! مجھے اکثر تمہیں دیکھنے کے لیے آنا پڑتا ہے میں چاہتا ہوں، تمہیں اپنے قریب بلا لوں۔"

سیدہ فاطمہ رض نے عرض کیا — "آپ ص کے قرب و جوار میں حارثہ رض بن نعمان کے بہت سے مکانات ہیں، آپ ان سے فرمائیے وہ کوئی نہ کوئی مکان خالی کر دیں گے۔"

حضرت حارثہ رض بن نعمان ایک متموّل انصاری تھے اور کئی مکانات کے مالک تھے۔ جب سے حضور ص مدینہ منورہ تشریف لائے تھے وہ اپنے کئی مکانات حضور ص کی نذر کر چکے تھے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مکانات مستحق مہاجرین میں تقسیم فرما دیئے تھے۔ جب سیدہ فاطمہ رض نے حارثہ رض کے مکان کے لیے حضور ص سے التماس کی تو آپ ص نے فرمایا :

"جانِ پدر! حارثہ سے اب کوئی اور مکان مانگتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ وہ پہلے ہی اللہ اور اللہ کے رسول ص کی خوشنودی کے لیے کئی مکانات دے چکے ہیں۔"

حضور ص کا ارشاد سن کر حضرت فاطمہ رض خاموش ہو گئیں — ہوتے ہوتے

یہ خبر حضرت حارثہؓ بن نعمان تک پہنچی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدہ فاطمہؑ کو اپنے قریب بلانا چاہتے ہیں لیکن مکان نہیں مل رہا، وہ نہایت مخلص اور ایثار پیشہ آدمی تھے، یہ خبر سنتے ہی بے تاب ہو گئے اور دوڑتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ آپؐ سیدہ فاطمہؑ کو کسی قریب کے مکان میں لانا چاہتے ہیں۔ میں یہ مکان جو آپؐ کے کاشانۂ اقدس کے متصل ہے، خالی کیے دیتا ہوں آپ فاطمہؑ کو اس میں بلا لیجیے۔ اے میرے آقا میرا جان و مال آپ پر قربان ہے۔ خدا کی قسم جو چیز حضورؐ مجھ سے لیں گے، مجھے اس کا آپ کے پاس رہنا زیادہ محبوب ہوگا بہ نسبت اس کے کہ میرے پاس رہے۔"

سرورِ عالمؐ نے حضرت حارثہؓ کے جذبۂ ایثار کی تحسین فرمائی اور ان کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت حارثہؓ کی پیشکش کے جواب میں فرمایا "تم سچ کہتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں خیر و برکت دے۔"

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کو حضرت حارثہؓ بن نعمان والے قریبی مکان میں منتقل کرا لیا۔

ازدواجی زندگی

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سیدہ فاطمہؑ کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ حضرت علیؑ سیدہ کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سیدہ بھی اپنے شوہر نامدار کا دل و جان سے احترام کرتی تھیں اور ان کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی لختِ جگر کو ہمیشہ نصیحت فرماتے رہتے تھے کہ عورت کا سب سے بڑا فرض خاوند کی اطاعت و فرماں برداری ہے، اس لیے وہ علیؑ کی ہر طرح اطاعت کریں۔ دوسری طرف حضورؐ حضرت علیؑ کو بھی تاکید فرماتے رہتے تھے کہ فاطمہؑ سے اچھا برتاؤ کرو۔ چنانچہ میاں بیوی کے مثالی تعلقات کی وجہ سے ان کا گھر جنت کا نمونہ بن گیا تھا۔ تاہم دو چار موقعے ایسے ضرور پیش آئے جن میں میاں بیوی میں معمولی رنجش پیدا ہو گئی، انسانی فطرت اور زمانے کے اقتضا کے پیشِ نظر میاں بیوی کے تعلقاتِ معاشرت میں ایسے اتفاقات کا پیش آجانا کوئی انہونی بات نہیں۔ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی رنجش بھی محض اتفاقی تھی اور جونہی حضور پرنورؐ نے مداخلت فرمائی ان کے دلوں میں ملال کا شائبہ تک نہ رہا۔

ایک دفعہ حضرت علیؑ اور حضرت سیدہؑ کے درمیان کسی بات پر کچھ رنجش ہو گئی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ بیٹی کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت روئے انور پر حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ آپؐ نے دونوں کو

سمجھا بجھا کر صفائی کرا دی۔ جب باہر تشریف لائے تو بہت بشاش تھے اور چہرۂ مبارک فرطِ مسرت اور اطمینان سے چمک رہا تھا صحابۂ کرامؓ نے پوچھا ــــــ "یارسول اللہ آپ گھر کے اندر گئے تو چہرۂ مبارک متغیر تھا اور باہر تشریف لائے ہیں تو بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے ہیں یہ کیا بات ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا، "میں نے ان دو شخصوں میں صلح صفائی کرا دی جو مجھے بہت زیادہ عزیز ہیں۔" (مدارج النبوۃ)

اسی طرح ایک بار اور میاں بیوی میں کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ سیدہ فاطمہؓ ناراض ہو کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت لے کر گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آ گئے۔ حضرت سیدہؓ نے شکایت پیش کی تو حضورؐ نے فرمایا ــــــ "بیٹی ذرا خیال کرو ایسا کون سا شوہر ہے جو اپنی بیوی کے پاس اس طرح خاموش چلا آتا ہے۔"

ایک دوسری روایت کے مطابق حضورؐ نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے ــــــ "بیٹی میری بات غور سے سنو، کوئی میاں بیوی ایسے نہیں ہیں جن کے درمیان کبھی اختلافِ رائے پیدا نہ ہوا اور کون مرد ایسا ہے جو ہر کام بیوی کے مزاج کے مطابق ہی کرتا ہے اور اپنی بیوی کی کسی بات پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرتا۔"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی سن کر سیدنا علیؓ پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا:

"خدا کی قسم آیندہ میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو یا جس سے تمہاری دل شکنی ہو۔"

(طبقات ابن سعد و اصابہ لابن حجرؒ)

"مدارج النبوۃ" میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے درمیان گھریلو کاموں کی تقسیم فرمادی تھی۔ چنانچہ گھر کے اندر جتنے کام تھے مثلاً چکی پیسنا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ، وہ سب سیدہ فاطمہؓ کے ذمہ تھے اور باہر کے سب کام مثلاً بازار سے سودا سلف لانا، اونٹ کو پانی پلانا وغیرہ حضرت علیؓ کے ذمہ تھے۔ اس طرح ان کی ازدواجی زندگی میں نہایت خوشگوار توازن پیدا ہو گیا تھا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل کے بھائیؓ نے حضرت علیؓ کو عوراء بنت ابی جہل سے نکاح کرنے کی ترغیب دی اور انہوں نے اس کی ہامی بھر لی۔ چنانچہ عوراء کے سرپرست حضورؐ سے اس نکاح کی اجازت لینے آئے۔ حضورؐ کو یہ بات سخت ناگوار گزری[1] آپؐ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا:۔

"بنی ہشام بن مغیرہ، علی بن ابی طالب سے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اجازت مانگتے ہیں۔ لیکن میں اجازت نہ دوں گا، کبھی نہ دوں گا، البتہ علی میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔"

اس کے بعد اپنی دوسری بیٹی حضرت زینبؓ کے شوہر حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ سیدۃ النساءؓ نے یہ خبر سنی تو وہ سخت آزردہ ہوئیں۔ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو سیدہؓ نے عرض کی:

"ابا جان علی مجھ پر سوت (سوکن) لانا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر حضورؐ کو سخت ملال ہوا۔

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اس نے مجھ سے جو بات کہی اس کو سچ کر کے دکھلا دیا اور جو وعدہ کیا وفا کیا۔ اور میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے نہیں کھڑا ہوا لیکن خدا کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔"

حضورؐ کو اس طرح ناراض دیکھ کر حضرت علیؓ نے بنت ابوجہل سے نکاح کا ارادہ فوراً ترک کر دیا اور پھر حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی زندگی میں کسی دوسرے نکاح کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

صحیح بخاری میں حضرت سہلؓ بن سعد سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؑ کے گھر تشریف لے گئے اور علیؓ کو نہ پایا۔ (حضرت فاطمہؑ سے) پوچھا، تمہارے ابن عم کہاں ہیں؟ بولیں، مجھ میں اور ان میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا وہ غصہ میں چلے گئے ہیں اور یہاں (دوپہر کو) نہیں لیٹے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا، دیکھو وہ کہاں ہیں۔ اس نے آ کر خبر دی کہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ وہ (حضرت علیؓ) لیٹے ہوئے تھے۔ پہلو سے چادر ہٹ گئی تھی اور مٹی جسم میں لگ گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مٹی پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ اٹھو ابوتراب، اٹھو ابوتراب۔"

حضورؐ حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ گھر لائے اور دونوں میاں بیوی میں صلح کرا دی۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کو ابوتراب کہلایا جانا عمر بھر بہت محبوب رہا۔

متذکرہ بالا تین چار اتفاقی واقعات کے سوا حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ نہایت خوشگوار رہی اور ان کا گھر پاکیزگی، اطمینان، سادگی، قناعت اور سعادت کا گہوارہ بنا رہا۔

ایک بار سیدہ فاطمہؑ کو بخار آگیا۔ رات انہوں نے سخت بے چینی میں کاٹی۔ حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ جاگتا رہا۔ پچھلے پہر ہم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ فجر کی اذان سن کر بیدار ہوا تو دیکھا کہ فاطمہؑ وضو کر رہی ہیں۔ میں نے مسجد میں جاکر نماز پڑھی واپس آیا تو دیکھا کہ فاطمہ معمول کے مطابق چکی پیس رہی ہیں۔ میں نے کہا، فاطمہ تمہیں اپنے حال پر رحم نہیں آتا۔ رات بھر تمہیں بخار رہا۔ صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرلیا، اب چکی پیس رہی ہو۔ خدا نہ کرے زیادہ بیمار ہو جاؤ۔

حضرت فاطمہؑ نے سر جھکا کر جواب دیا کہ اگر میں اپنے فرائض ادا کرتے کرتے مر بھی جاؤں تو کچھ پرواہ نہیں ہے۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھی، اللہ کی اطاعت کے لیے، اور چکی پیسی تمہاری اطاعت اور بچوں کی خدمت کے لیے۔

سیدنا حضرت حسنؑ فرماتے ہیں کہ ہماری مادرِ گرامی کی زندگی میں باہر کے تمام کام ہمارے والدِ بزرگوار انجام دیتے تھے اور گھر کے اندر تمام کام کاج، کھانا پکانا، چکی پیسنا، جھاڑو دینا وغیرہ سب ہماری مادرِ گرامی خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں۔

حضرت فاطمہؑ خانہ داری کے کاموں کی انجام دہی کے لیے کبھی اپنی کسی رشتہ دار یا ہمسایہ کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلاتی تھیں۔ نہ کام کی کثرت اور نہ کسی قسم کی محنت مشقت سے گھبراتی تھیں۔ ساری عمر شوہر کے سامنے

حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں اور نہ ان سے کسی چیز کی فرمائش کی۔

کھانے کا یہ اصول تھا کہ چاہے خود فاقے سے ہوں جب تک شوہر اور بچوں کو نہ کھلا لیتیں خود ایک لقمہ بھی منہ میں نہ ڈالتیں۔

ایک دفعہ حضرت علیؑ سر پر گھاس کا گٹھا اٹھائے گھر تشریف لائے اور حضرت فاطمہؑ سے کہا، ذرا یہ گٹھا اتارنے میں میری مدد کرو۔ اس وقت وہ کسی کام میں مصروف تھیں جلد نہ اٹھ سکیں۔ حضرت علیؑ نے گٹھا زمین پر دے مارا اور کہا :- "معلوم ہوتا ہے تم گھاس کے گٹھے کو ہاتھ لگانے میں سبکی محسوس کرتی ہو"

حضرت فاطمہؑ نے معذرت کرتے ہوئے کہا، ہرگز نہیں میں کام میں مصروفیت کی وجہ سے جلد نہ اٹھ سکی ورنہ جو کام میرے ابا جان رسول خدا ہوتے ہوئے اپنے دستِ مبارک سے کرتے ہیں میں انہیں کرنے میں سُبکی کیسے محسوس کر سکتی ہوں۔

حضرت علیؑ ان کا جواب سن کر متبسم ہو گئے اور کوٹھڑی کے اندر چلے گئے۔

حضرت فاطمہؑ کے یہی اوصاف و خصائل تھے کہ ان کی وفات کے بعد جب کسی نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ فاطمہؑ کا حسنِ معاشرت کیسا تھا تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا :

"فاطمہ جنت کا ایک خوشبودار پھول تھی جس کے مرجھانے کے باوجود اس کی خوشبو سے اب تک میرا دماغ معطر ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں مجھے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔"
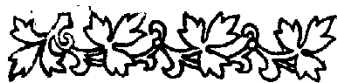
شمائل و خصائل

سیدہ فاطمۃ الزہرا کی صورت اور گفتار و رفتار سرورِ عالم ﷺ سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ حضور پر نورؐ کے بہت سے ظاہری و باطنی اوصاف ان کی ذات میں موجود تھے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ شکل و صورت میں حضرت فاطمہؓ اپنی والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے بہت مشابہ تھیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ہے کہ میں نے طور و طریق کی خوبی، اخلاق و کردار کی پاکیزگی، نشست و برخاست، طرزِ گفتگو اور لب و لہجہ میں رسول اللہ ﷺ کے مشابہ فاطمہؓ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کی رفتار بھی بالکل رسول اللہ ﷺ کی رفتار تھی۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ فاطمہ رفتار و گفتار میں رسول اللہ ﷺ کا بہترین نمونہ تھیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم سب بیویاں آپؐ کے پاس بیٹھی تھیں کہ فاطمہؓ سامنے سے آئیں، بالکل رسول اللہ ﷺ کی چال تھی۔ ذرا بھی فرق نہ تھا۔ آپؐ نے بڑے تپاک سے بلاکر (مرحبا یا بنتی کہہ کر) پاس بٹھا لیا۔ پھر آپؐ نے اُن کے کان میں کچھ فرمایا، وہ رونے لگیں۔ ان کو روتے دیکھ کر آپؐ نے پھر اُن کے کان میں کچھ کہا، وہ ہنسنے لگیں۔

میں نے فاطمہ سے کہا، فاطمہ تمام بیویوں کو چھوڑ کر تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے راز کی باتیں کہتے ہیں اور تم روتی ہو۔ آپؐ جب تشریف لے گئے تو میں نے فاطمہؓ سے واقعہ (رونے اور ہنسنے کا سبب) پوچھا۔ انہوں نے کہا، میں ابا جان کا راز فاش نہیں کروں گی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو میں نے فاطمہؓ سے کہا، فاطمہ میرا تم پر جو حق ہے میں تم کو اس کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اس دن کی بات مجھ سے کہہ دو۔ انہوں نے کہا، ہاں اب ممکن ہے، میرے رونے کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ نے اپنی جلد وفات کی خبر دی تھی اور ہنسنے کا سبب یہ تھا کہ آپؐ نے فرمایا، فاطمہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تم دنیا کی عورتوں کی سردار ہو۔[۱]

(سیرۃ عائشہؓ بحوالہ صحیحین)

سیدہ فاطمہؓ ہمیشہ سچی اور صاف بات کہتی تھیں۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کی صدق مقالی اور صاف گوئی کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے:۔

"میں نے فاطمہؓ کے والدِ بزرگوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا فاطمہؓ سے زیادہ سچا اور صاف گو کسی کو نہ دیکھا۔" (الاستیعاب)

---

[۱] بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ کے رونے اور ہنسنے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب حضورؐ اپنے وصال سے پہلے شدید علیل تھے۔ لیکن اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کسی اور موقع پر پیش آیا۔ اس وقت حضورؐ چل پھر لیتے تھے کیونکہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضورؐ اٹھ کر تشریف لے گئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ سے واقعہ پوچھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

عبادت اور شب بیداری

سیّدہ فاطمۃ الزہراؑ کو عبادتِ الٰہی سے بے انتہا شغف تھا۔ وہ قائم اللیل اور دائم الصّوم تھیں۔ خوفِ الٰہی سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتی تھیں۔ مسجدِ نبوی کے پہلو میں گھر تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و مواعظ گھر بیٹھے سنا کرتی تھیں۔ ان میں عقوبت اور محاسبۂ آخرت کا ذکر آتا تو ان پر ایسی رقّت طاری ہوتی کہ روتے روتے غش آجاتا تھا۔ تلاوتِ قرآن کرتے وقت عقوبت و عذاب کی آیات آجاتیں تو جسمِ اطہر پر کپکپی طاری ہوجاتی اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوجاتا۔

زبان پر اکثر اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری رہتا تھا۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ میں فاطمہ کو دیکھتا تھا کہ کھانا پکاتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ خدا کا ذکر کرتی جاتی تھیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں اور قرآن پڑھتی رہتی تھیں۔ وہ چکی پیستے وقت بھی (کوئی گیت گانے کے بجائے) قرآنِ پاک پڑھتی رہتی تھیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں ان کی اسی عادت کی طرف اشارہ کیا ہے:

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کا بیان ہے کہ فاطمہ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا عبادت

کرتی تھیں لیکن گھر کے کام دھندوں میں فرق نہ آنے دیتی تھیں۔

سیدنا حضرت حسنؓ بن علیؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنی والدہ ماجدہ کو (گھر کے کام دھندوں سے فرصت پانے کے بعد) صبح سے شام تک محراب عبادت میں اللہ تعالیٰ کے آگے گریہ وزاری کرتے، نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اس کی حمد وثنا کرتے اور دعائیں مانگتے دیکھا کرتا تھا۔ یہ دعائیں وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے مانگتی تھیں۔

عبادات کرتے وقت سیدہ فاطمہؓ کا نورانی چہرہ زعفرانی ہو جاتا تھا جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی یہاں تک کہ اکثر مصلےٰ آنسوؤں سے بھیگ جاتا تھا۔

ایک اور روایت میں حضرت حسنؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات میری مادرِ گرامی نماز کے لیے اپنی گھریلو مسجد کی محراب میں کھڑی ہوئیں اور ساری رات نماز میں مشغول رہیں، اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ مادرِ گرامی نے مؤمنین اور مؤمنات کے لیے بہت دعائیں مانگیں مگر اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی۔

میں نے عرض کیا "اماں جان آپ نے سب کے لیے دعا مانگی لیکن اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی؟"

فرمایا:۔ "بیٹا پہلا حق باہر والوں کا ہے اس کے بعد گھر والوں کا۔"

(مدارج النبوۃ)

حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی عبادت کا یہ حال تھا کہ اکثر ساری ساری رات نماز میں گزار دیتی تھیں۔

بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی عبادتِ الٰہی کو ترک نہ کرتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کے احکام کی تعمیل، اس کی رضا جوئی

اور سنّتِ نبوی کی پیروی ان کے رگ و ریشے میں سما گئی تھی۔ وہ دنیا میں
رہتے ہوئے اور گھر گرہستی کے کام کاج کرتے ہوئے بھی ایک اللہ کی
ہو کر رہ گئی تھیں
اسی لیے ان کا لقب بتول پڑ گیا تھا۔
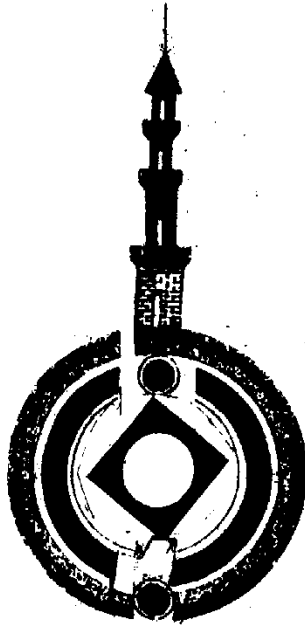
علم و فضل

حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے قرآنِ حکیم سے شغف کا ذکر ان کی عبادت اور شب بیداری کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ چونکہ انہوں نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی اس لیے حدیث روایت کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ ان سے صرف اٹھارہ (بروایتِ دیگر انیس) احادیث مروی ہیں۔ ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں حضرت علیؓ بن ابی طالب، اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت اُمِّ ہانی اور حضرت سلمٰی اُمِّ رافعؓ شامل ہیں۔

امام دارقطنیؒ نے حضرت فاطمہؓ سے مروی احادیث پر مشتمل ایک کتاب تیار کی تھی جس کا نام مُسندِ فاطمہؓ رکھا تھا۔

تفقہ فی الدین سے بھی بہرہ ور تھیں۔ مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں گوشت تناول فرما رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ حضورؐ اسی طرح نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ نے کسی موقع پر آپؐ کا کوئی ارشاد سنا تھا جس سے وہ سمجھی تھیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کا دامنِ اقدس پکڑ کر عرض کی:

"ابا جان وضو کر لیجئے۔"

آپؐ نے فرمایا، "جانِ پدر، وضو کی ضرورت نہیں، تمام اچھے کھانے

آگ ہی پر تو پکتے ہیں ۔"

مسندِ احمد ہی میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کسی سفر میں گئے تھے۔ واپس تشریف لائے تو حضرت فاطمہؑ نے قربانی کا گوشت پیش کیا۔ ان کو اس کے کھانے میں عذر ہوا۔[1] حضرت فاطمہؑ نے کہا، اس کے کھانے میں کچھ حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی ہے۔

ایک مرتبہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؑ سے پوچھا "بیٹی ذرا بتاؤ تو عورت کی سب سے اچھی صفت کون سی ہے ؟"

حضرت فاطمہؑ نے جواب دیا :

"عورت کی سب سے اچھی صفت یہ ہے کہ نہ وہ کسی غیر مرد دیکھے اور نہ کوئی غیر مرد اس کو دیکھے۔ (احیاء العلوم امام غزالیؒ)

"دائرہ معارفِ اسلامیہ" میں ہے کہ —— "حضرت فاطمہؑ شعر بھی کہتی تھیں۔ (ان اشعار میں سے بعض کے لیے دیکھئے : ——

علی فہمی : جسن الصحابہ، استانبول ۱۳۲۴ھ ص ۱۲۶

نیز عبدالقیوم : فہرست شعراء لسان العرب)

بعض مواعظ جنہیں حضرت فاطمہؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے بعد کے زمانے میں فارسی زبان میں ترجمہ اور شرح کیے گئے ہیں۔

(دیکھئے اللمعۃ البیضاء ایران ۱۲۹۷ھ نیز دیکھئے معجم المطبوعات)

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۹۶ - دانشگاہ پنجاب، لاہور)

---

[1] اس سے پہلے ایک موقع پر حضورؐ نے قربانی دینے والوں کو قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا بعد میں حضورؐ نے اجازت دے دی لیکن حضرت علیؑ کو اس کا علم نہیں تھا۔

زُہد و قناعت

جس زمانے میں فتوحاتِ اسلام روز بروز وسعت پذیر ہو رہی تھیں، مدینہ منورہ میں بکثرت مالِ غنیمت آنا شروع ہو گیا تھا۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ فاتح کو لڑائی کے بعد جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا اس کا تین چوتھائی لشکر کا حصہ ہوتا اور ایک چوتھائی فریقِ غالب کے سردار کا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمِ الٰہی اِنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ۔ (یعنی اے مسلمانو جان رکھو کہ جو مال تم لڑائی میں لوٹ کر لاؤ اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا اور رسول کے قرابت داروں کا اور یتیموں اور مسکینوں کا حق ہے) کے مطابق اس رواج میں تبدیلی کر دی اور صرف پانچواں حصہ اپنے پاس رکھ کر چار حصے عامۃ المسلمین میں تقسیم کر دیتے۔ اپنا حصہ بھی حضورؐ سب راہِ خدا میں صرف کر دیتے اور فقر و فاقہ اور قناعت سے اپنی زندگی گزارتے حتیٰ کہ ازواجِ مطہراتؓ اور اپنی لختِ جگر فاطمۃ الزہراءؑ کے لیے بھی آپؐ نے آسائش کا کوئی انتظام نہ فرمایا، اگر کبھی سیدہ فاطمہؑ اشارۃً کنایتہً لونڈی یا کنیز کے لیے استدعا کرتیں تو حضورؐ فرماتے —— "بیٹی فقراء اور یتامیٰ کا حق فائق ہے۔" کبھی ان کی دوسرے طریقوں سے سمجھا بجھا کر تسلی و تشفی فرما دیتے۔

ایک دفعہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مالِ غنیمت میں کچھ غلام اور لونڈیاں آئیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو معلوم ہوا تو انہوں نے سیدہ فاطمہؑ

سے فرمایا:

"فاطمہ چکی پیستے پیستے تمہارے ہاتھوں میں آبلے (گھٹے) پڑ گئے ہیں اور چولھا پھونکتے پھونکتے تمہارے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ہے۔ آج حضورؐ کے پاس مالِ غنیمت میں بہت سی لونڈیاں آئی ہیں۔ جاؤ اپنے ابا جان سے ایک لونڈی مانگ لاؤ۔"

سیدہ فاطمۃ الزہراؑ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن شرم و حیا حرفِ مدعا زبان پر لانے میں مانع ہوئی۔ تھوڑی دیر بارگاہِ نبوی میں حاضر رہ کر گھر واپس آگئیں اور حضرت علیؓ سے کہا کہ مجھے حضورؐ سے کنیز مانگنے کی ہمت نہیں پڑتی آپ میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ دوسرے دن دونوں میاں بیوی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنی تکالیف بیان کیں اور ایک لونڈی کے لیے درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا، "میں تم کو کوئی لونڈی خدمت کے لیے نہیں دے سکتا۔ ابھی اصحابِ صُفّہ کی خورد و نوش کا تسلی بخش انتظام مجھے کرنا ہے میں ان لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر فقر و فاقہ اختیار کیا ہے۔

حضورؐ کا ارشاد سن کر دونوں میاں بیوی خاموشی سے اپنے گھر چلے گئے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سیدہ فاطمہؓ لونڈی مانگنے کے لیے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو وہاں لوگوں کا مجمع دیکھ کر کچھ کہہ نہ سکیں کیونکہ ان کے مزاج میں شرم و حیا بہت زیادہ تھی۔ آخر اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اپنی ضرورت کا اظہار کر کے واپس آگئیں۔ اُمّ المؤمنینؓ نے حضورؐ تک یہ بات پہنچائی تو دوسرے دن حضورؐ خود حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور سیدہؓ سے پوچھا:

" فاطمہ کل تم کس غرض کے لیے میرے پاس گئی تھیں۔"
سیدہؓ شرم کے مارے اب بھی کچھ عرض نہ کر سکیں۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے عرض کیا:

" یارسول اللہ فاطمہ کی یہ حالت ہے کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں۔ مشک بھرنے سے سینے پر رسی کے نشان ہو گئے ہیں۔ ہر وقت گھر کے کاموں میں مصروف رہنے سے کپڑے میلے ہو جاتے ہیں کل میں نے ان سے کہا تھا کہ آج کل حضورؐ کے پاس مالِ غنیمت میں لونڈیاں آئی ہوئی ہیں تم جا کر اپنی تکلیف بیان کرو اور ایک لونڈی مانگ لاؤ تاکہ تمہاری تکلیف کچھ ہلکی ہو جائے۔ یہی درخواست لے کر یہ کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "بیٹی بدر کے شہیدوں کے یتیم تم سے پہلے مدد کے حقدار ہیں۔"

پھر آپؐ نے فرمایا، "تم جس چیز کی خواہش مند تھیں اس سے بہتر ایک چیز میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہر نماز کے بعد دس دس بار سُبحَانَ اللہِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور اللہُ اکبرُ پڑھا کرو۔ اور سوتے وقت تینتیس مرتبہ سُبحَانَ اللہ تینتیس مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور چونتیس مرتبہ اللہُ اکبرُ پڑھ لیا کرو۔ یہ عمل تمہارے لیے لونڈی اور غلام سے بڑھ کر ثابت ہوگا۔" [1]

سیدہ فاطمہؓ نے عرض کیا، "میں اللہ اور اللہ کے رسول سے اسی

---

[1] یہ وظیفہ "تسبیحِ فاطمہؓ" کے نام سے مشہور ہے۔

حال میں راضی ہوں۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ فاطمہؓ کو لونڈی نہیں دی گئی لیکن وہ بالکل مطمئن ہوگئیں اور حسبِ سابق خوشدلی کے ساتھ اپنے کام کاج میں مصروف رہنے لگیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس واقعہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اَٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی ہر صبح شام تھا
آخر گئیں جناب رسولِ خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق وہاں اذنِ عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے — کل کس لیے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں — حیدرؓ نے اُن کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن — جن کا کہ صُفّۂ نبوی میں قیام تھا
میں اُن کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب اُن پر گزرتی ہیں — میں اس کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم تھا ان کا حق — جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں — جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی بسر ہر اہلِ بیتِ مطہرؓ نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانامؐ تھا

ایک دفعہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ مسجدِ نبوی میں تشریف لائیں اور روٹی کا ایک ٹکڑا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا۔ حضورؐ نے پوچھا، "یہ کہاں

سے آیا ہے۔"

سیدہ رضؓ نے عرض کیا " ابا جان تھوڑے سے جَو پیس کر روٹی پکائی تھی، جب بچوں کو کھلا رہی تھی خیال آیا کہ ابا جان کو بھی تھوڑی سی کھلا دوں معلوم نہیں وہ کس حال میں ہوں، اے خدا کے رسولِ برحقؐ یہ روٹی تیسرے وقت نصیب ہوئی ہے۔"

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روٹی تناول فرمائی اور سیدہؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

" اے میری بچی چار وقت کے بعد یہ روٹی کا پہلا ٹکڑا ہے جو تیرے باپ کے منہ میں پہنچا ہے۔"

ایک دفعہ سیدۃ النساءؑ بیمار ہو گئیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپؐ نے اپنے ایک جاں نثار حضرت عمرانؓ بن حصین کو ساتھ لیا اور اپنی لختِ جگر کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ دروازے پر پہنچ کر داخلے کی اجازت مانگی۔ اندر سے سیدہؑ کی آواز آئی " تشریف لایئے"

حضورؐ نے فرمایا۔" میرے ساتھ عمران بن حصین بھی ہیں۔"

سیدہؑ نے عرض کیا " ابا جان! اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا ہے میرے پاس ایک عبا کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہے کہ پردہ کروں۔"

حضورؐ نے اپنی چادر مبارک اندر پھینک دی اور فرمایا " بیٹی اس سے پردہ کر لو۔"

اس کے بعد حضورؐ اور حضرت عمرانؓ اندر تشریف لے گئے اور سیدہؑ سے ان کا حال پوچھا۔

سیدہؓ نے عرض کی "آبا جان شدتِ درد سے بے چین ہوں اور بھوک سے نڈھال ہوں کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔

حضورؐ نے فرمایا، "اے میری بچی صبر کر، میں بھی آج تین دن سے بھوکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے میں جو کچھ مانگتا وہ ضرور مجھے عطا کرتا لیکن میں نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی۔" پھر حضورؐ نے اپنا دستِ شفقت حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی پشت پر پھیرا اور فرمایا:

"اے لختِ جگر دنیا کے مصائب سے دل شکستہ نہ ہو، تم جنّت کی عورتوں کی سردار ہو۔"

ایک دفعہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اور سیدہ فاطمۃ الزہراؓ دونوں آٹھ پہر سے بھوکے تھے۔ شام کے قریب ایک تاجر کے اونٹ آئے اسے اونٹوں سے سامان اتروانے کے لیے ایک مزدور کی ضرورت تھی۔ حضرت علیؓ نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور پہر رات تک اس کے اونٹوں کا سامان اتارا۔ تاجر نے ایک درہم محنت کا معاوضہ دیا۔ چونکہ رات زیادہ آچکی تھی اس لیے خورد و نوش کی دکانیں بند ہو چکی تھیں تاہم ایک دکان سے جَو مل گئے۔ شیرِ خداؓ ایک درہم کے جَو لے کر گھر آئے۔ سیدہ فاطمہؓ دیر سے راہ تک رہی تھیں شوہرِ نامدار کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ جَو ان سے لے کر چکی میں پیسے، پھر ان کو گوندھا۔ آگ جلائی اور روٹی پکا کر علی مرتضیٰؓ کے سامنے رکھ دی۔ جب وہ کھا چکے تو خود کھانے بیٹھیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس وقت سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قولِ مبارک یاد آیا کہ فاطمہ دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے۔

ایک دن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانۂ اقدس میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا کے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ حضورؐ بھوک کی حالت میں کاشانۂ اقدس سے باہر نکلے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ مل گئے۔ اتفاق سے وہ بھی اس دن فاقہ سے تھے۔ حضورؐ ان دونوں کو ساتھ لے کر حضرت ابوایوبؓ انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت ابوایوبؓ اپنے کھجوروں کے باغ میں گئے ہوئے تھے اور گھر میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ حضرت ابوایوبؓ کی زوجہ محترمہ نے حضورؐ کو اہلاً وسہلاً کہا۔ حضورؐ نے پوچھا، "ابوایوب کہاں ہیں؟"

حضرت ابوایوبؓ کا باغ مکان کے بالکل قریب تھا انہوں نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سنی تو کھجوروں کا ایک گچھا توڑ کر بے تابانہ دوڑتے ہوئے گھر پہنچے اور یہ گچھا مہمانانِ عزیز کی خدمت میں پیش کیا، اس کے ساتھ ہی فوراً ایک بکری ذبح کی۔ آدھے گوشت کا سالن پکوایا اور آدھے کے کباب بنوائے اور حضورؐ کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حضورؐ نے ایک روٹی پر کچھ گوشت رکھ کر فرمایا:

"اسے فاطمہ کو بھیج دو اس پر کئی دن کا فاقہ ہے۔"

حضرت ابوایوبؓ نے تعمیلِ ارشاد کی اور حضورؐ نے اپنے رفقائے کرام کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ پُرتکلف کھانا کھاتے ہوئے حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی اور آپؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن بندوں سے دنیاوی نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔" (یعنی ان نعمتوں کا حق تم نے کیسے ادا کیا۔)

حضرت فاطمۃ الزہرا سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے میرے پاس آکر دریافت فرمایا، "میرے دونوں بیٹے حسنؑ و حسینؑ کہاں ہیں؟" میں نے عرض کیا، "آبا جان آج صبح ہمارے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی، علیؑ نے مجھ سے کہا کہ میں ان دونوں بچوں کو ساتھ لے کر فلاں یہودی کے پاس (مزدوری کے لیے) جا رہا ہوں، ایسا نہ ہو کہ یہ بچے کھانے کے لیے روئیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ اس طرف تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ دونوں بچے ایک حوض کے پاس کھیل رہے ہیں اور ان کے قریب چند کھجوریں رکھی ہوئی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، "اے علی اس سے پہلے کہ دھوپ تیز ہو جائے ان بچوں کو واپس گھر لے جاؤ۔"

حضرت علیؑ نے عرض کیا "یا رسول اللہ صبح سے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ آپؐ تھوڑی دیر تشریف رکھیں میں درخت سے گری ہوئی کھجوریں فاطمہ کے لیے بھی چن لوں" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کچھ دیر کے لیے رک گئے اور اس اثنا میں حضرت علیؑ نے میرے لیے کھجوریں چن کر ایک کپڑے میں ڈال لیں اور چل پڑے۔ بچوں میں سے ایک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے اٹھا لیا اور ایک کو حضرت علیؑ نے اور اسی طرح سب گھر پہنچے۔

(طبرانی۔ ہیثمی)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم پر کئی دن ایسے گزر گئے کہ نہ تو ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز تھی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کے پاس۔ اسی زمانے میں ایک دن میں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک دینار پڑا پایا۔ تھوڑی

دیر میں نے سوچا کہ اسے اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں۔ آخر میں نے اسے اٹھا لیا کیونکہ سخت مصیبت (تنگدستی) میں مبتلا تھا۔ اسے لے کر ایک دوکاندار کے پاس آیا اور آٹا خرید کر فاطمہؓ کے پاس لے گیا اور ان سے کہا، اسے گوندھو اور روٹی پکاؤ۔ انہوں نے آٹا گوندھنا شروع کیا۔ اس وقت بھوک کی وجہ سے ان کی کمزوری کی یہ کیفیت تھی کہ کمر جھک گئی تھی اور ان کی پیشانی کے بال لگن تک پہنچ رہے تھے۔ بہرحال انہوں نے جوں توں کر کے آٹا گوندھا اور روٹی پکائی پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا "اسے کھالو اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ رزق دیا ہے۔

(کنز العمال۔ مسند ابوداؤد)

ایک دن سرورِ عالم ﷺ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے گھر تشریف لے گئے، آپؐ نے دیکھا کہ سیدۃ النساءؓ اونٹ کی کھال کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور اس میں بھی تیرہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ وہ آٹا گوندھ رہی ہیں اور زبان پر کلام اللہ کا ورد جاری ہے۔ حضور ﷺ یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:۔

"فاطمہ دنیا کی تکلیف کا صبر سے خاتمہ کر اور آخرت کی دائمی مسرت کا انتظار کر۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نیک اجر دے گا۔"

حضرت عمرانؓ بن حصینؓ سے روایت ہے کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ سامنے سے حضرت فاطمہؓ آئیں اور بالکل حضورؐ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ آپؐ نے فرمایا، اے فاطمہ قریب

یہ ذرا قریب ہوئیں۔ آپؐ نے پھر فرمایا، اے فاطمہ قریب ہو، یہ ذرا اور قریب ہوگئیں۔ آپؐ نے فرمایا، اے فاطمہ قریب ہو۔ یہ آپؐ سے اور قریب ہوگئیں اور بالکل آپؐ کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور خون نہیں رہ گیا تھا۔ حضورؐ نے اپنی انگلیاں پھیلائیں پھر اپنی ہتھیلی حضرت فاطمہؓ کے سینہ پر رکھی اور اپنا سر مبارک اٹھا کر فرمایا، اے میرے اللہ، بھوک کے پیٹ کو بھر دینے والے اور حاجت کو پورا کرنے والے اور گرے ہوئے کو بلند کرنے والے، فاطمہ بنت محمدؐ کو بھوکا نہ رکھ۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ بھوک کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کے چہرے پر جو پیلا پن تھا وہ جاتا رہا اور خون ظاہر ہوگیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد میں نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ اے عمران مجھے اس وقت سے کبھی بھوک نے نہیں ستایا۔ (طبرانی)

ایثار و سخاوت

ایک دفعہ قبیلہ بنو سُلَیم کے ایک بہت بوڑھے آدمی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضورؐ نے انہیں دین کے ضروری احکام و مسائل بتلائے اور پھر ان سے پوچھا:

"کیا تمہارے پاس کچھ مال بھی ہے؟"

انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ـــــ قسم ہے اللہ کی، بنو سُلَیم کے تین ہزار آدمیوں میں سب سے زیادہ غریب اور محتاج میں ہی ہوں۔"

حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"تم میں سے کون اس مسکین کی مدد کرے گا؟"

سید الخزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ اٹھے اور کہا:ـــــ یا رسول اللہ میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں اس کو دیتا ہوں۔"

حضورؐ نے فرمایا "تم میں سے کون ہے جو اس کا سر ڈھانک دے؟"

سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ اٹھے اور اپنا عمامہ اتار کر نو مسلم اعرابی کے سر پر رکھ دیا۔

پھر حضورؐ نے فرمایا:۔ کون ہے جو اس کی خوراک کا بندوبست کرے؟"

حضرت سلمان فارسیؓ نے ان صاحب کو ساتھ لیا اور ان کی خوراک کا انتظام کرنے لگے۔ چند گھروں سے دریافت کیا لیکن وہاں سے کچھ نہ ملا۔ آخر سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا ـــــ سیدہؓ نے

پوچھا، کون ہے ؟

حضرت سلمانؓ نے سارا واقعہ بیان کیا اور التجا کی "اے سچے رسولؐ کی بیٹی، اس مسکین کی خوراک کا بندوبست کیجئے۔"

سیّدۂ عالمؑ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: ـــــ اے سلمان، خدا کی قسم آج سب کو تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی ـــــ جاؤ یہ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ فاطمہ بنتِ محمدؐ کی یہ چادر رکھ لو اور اس کے عوض اس مسکین کو کچھ جنس دے دو۔"

حضرت سلمانؓ اعرابی کو ساتھ لے کر شمعون کے پاس پہنچے اور اس سے تمام کیفیت بیان کی۔ وہ دریائے حیرت میں غرق ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں ـــــ سیّدۂ عالمؑ کے پاکیزہ کردار کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

"اے سلمان خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے۔ تم گواہ رہنا کہ میں فاطمہؑ کے باپؐ پر ایمان لایا۔"

اس کے بعد کچھ غلّہ حضرت سلمانؓ کو دیا اور چادر بھی سیّدہ فاطمہؑ کو واپس بھیج دی۔ وہ سیّدہؑ کے پاس واپس آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے اناج پیسا اور جلدی سے اعرابی کے لیے روٹیاں پکا کر حضرت سلمانؓ کو دیں۔ انہوں نے کہا "اے میرے آقا کی لختِ جگر ان میں سے کچھ بچوں کے لیے رکھ لیجئے۔"

سیّدۃ النساءؑ نے جواب دیا:

"سلمان جو چیز میں راہِ خدا میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لیے

جائز نہیں۔"

حضرت سلمانؓ روٹیاں لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے وہ روٹیاں اعرابی کو دیں اور پھر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کے سر پر اپنا دستِ شفقت پھیرا، آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کی:۔

"بارِ الٰہا فاطمہ تیری کنیز ہے اس سے راضی رہنا۔"

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودی چادرِ خود را فروخت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ساری رات ایک باغ سینچا اور اجرت میں تھوڑے سے جَو حاصل کیے۔ سیدہ فاطمہؓ نے ان کا ایک حصہ لے کر آٹا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ عین کھانے کے وقت ایک مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا "میں بھوکا ہوں" حضرت سیدہؓ نے وہ سارا کھانا اسے دے دیا۔ پھر باقی اناج میں سے کچھ حصہ پیسا اور کھانا پکایا۔ ابھی کھانا پک کر تیار ہوا ہی تھا کہ ایک یتیم نے دروازہ پہ آکر دستِ سوال دراز کیا۔ وہ سب کھانا اُسے دے دیا۔ پھر انہوں نے باقی اناج پیسا اور کھانا تیار کیا۔ اس مرتبہ ایک مشرک قیدی نے اللہ کی راہ میں کھانا مانگا ـــــ وہ سب کھانا اس کو دے دیا۔ غرض سب اہلِ خانہ نے اس دن فاقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس گھر کے قدسی صفات مکینوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا۔ (الدھر)

(اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک دفعہ کسی نے سیدہ فاطمہؑ سے پوچھا، چالیس اونٹوں کی زکوٰۃ کیا ہوگی؟ سیّدہؑ نے فرمایا:

"تمہارے لیے صرف ایک اونٹ اور اگر میرے پاس چالیس اونٹ ہوں تو میں سارے ہی راہِ خدا میں دے دوں۔"

سیّدنا حضرت حسنؑ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک وقت کے فاقہ کے بعد ہم سب کو کھانا میسّر ہوا۔ والدِ بزرگوار (حضرت علی کرّم اللہ وجہہ) حسینؑ اور میں کھا چکے تھے لیکن والدہ ماجدہ (سیدۃ النساءؑ) نے ابھی نہیں کھایا تھا۔ انہوں نے ابھی روٹی پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ دروازے پر ایک سائل نے صدا دی "رسول اللہ کی بیٹی میں دو وقت کا بھوکا ہوں میرا پیٹ بھر دو۔" والدہ محترمہ نے فوراً کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا اور مجھ سے فرمایا، "جاؤ یہ کھانا سائل کو دے آؤ۔ مجھے تو ایک ہی وقت کا فاقہ ہے اور اس نے دو وقت سے نہیں کھایا۔"

شرم وحیا

سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پردہ کی نہایت پابند تھیں اور حد درجہ حیا دار تھیں۔ ایک بار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں طلب فرمایا تو وہ شرم سے لڑکھڑاتی ہوئی آئیں۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے ان سے پوچھا، بیٹی عورت کی سب سے اچھی صفت کونسی ہے تو انہوں نے عرض کیا:۔

"عورت کی سب سے اعلیٰ خوبی یہ ہے کہ نہ وہ کسی غیر مرد کو دیکھے اور نہ کوئی غیر مرد اس کو دیکھے۔" [1]

ایک مرتبہ سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئیں کہ آپؐ سے کوئی لونڈی طلب کریں لیکن فرطِ حیا سے دل کی بات زبان پر نہ لا سکیں اور بغیر کچھ کہے واپس آگئیں۔

ایک دفعہ حضورؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ آپؐ کے پیچھے ایک نابینا صحابی حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ بھی اندر چلے گئے۔ سیدہ فاطمہؓ انہیں دیکھ کر کوٹھڑی میں چھپ گئیں، جب وہ چلے گئے تو حضورؐ نے فرمایا، بیٹی تم چھپ کیوں گئی تھیں۔ ابنِ اُمِّ مکتوم تو اندھے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا، بابا جان

---

[1] سیدہؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جان بوجھ کر نامحرم مردوں کو شوق سے نہ دیکھا جائے۔ (ان پر اتفاقیہ نظر پڑنا یا کسی دینی ضرورت کے تحت ان کو دیکھنا ناجائز نہیں)

اگر وہ اندھے ہیں تو میں تو ایسی نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ غیر مرد کو دیکھا کروں۔

شرم و حیا کی انتہا یہ تھی کہ عورتوں کا جنازہ بغیر پردہ کے نکلنا پسند نہ تھا۔ اسی بناء پر اپنی وفات سے پہلے وصیت کی کہ میرے جنازے پر کھجور کی شاخوں کے ذریعے کپڑے کا پردہ ڈال دیا جائے اور جنازہ رات کے وقت اٹھایا جائے تاکہ اس پر غیر مردوں کی نظر نہ پڑے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی انصاف پسند نہ تھا۔ آپؐ ہر معاملے میں پورے انصاف سے کام لیتے تھے۔ اپنی ازواجِ مطہرات کے معاملے میں آپؐ کا یہ معمول تھا کہ باری باری ہر ایک کے حجرے میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ اُمّ المومنین حضرت سودہؓ کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دے دی تھی اس لیے حضورؐ ان کے حجرے میں دو راتیں رہا کرتے تھے۔ صحابۂ کرامؓ اکثر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باری کے دو دنوں میں حضورؐ کی خدمت میں تحائف اور ہدایا بھیجتے تھے۔ دوسری ازواجؓ چاہتی تھیں کہ صحابہ ان کی باری کے دن بھی اسی طرح تحائف بھیجا کریں لیکن سب اس معاملے میں حضورؐ سے براہِ راست گفتگو کرنے میں جھجکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ حضرت فاطمہؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں بھیجا جائے، کیونکہ آپؐ ان کو بہت مانتے ہیں۔ سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں، اپنی دوسری سوتیلی ماؤں کی درخواست پیش کی اور عرض کیا، ابا جان وہ سب حضرت صدیقہؓ کے معاملے میں آپؐ سے انصاف چاہتی ہیں۔

صحابۂ کرامؓ جو کچھ بھیجتے تھے اپنی خوشی سے بھیجتے تھے۔ حضورؐ نے ان کو اس کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دی تھی، اس لیے بے انصافی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"بیٹی جس کو میں چاہوں کیا تم اس کو نہیں چاہو گی۔"
حضرت فاطمہؓ شرما کر فوراً واپس چلی آئیں۔ ازواجِ مطہراتؓ نے پھر اصرار کیا کہ بیٹی تم دوبارہ حضورؐ کی خدمت میں جاؤ اور یہ معاملہ پیش کرو۔ سیدہؓ نے کہا، خدا کی قسم میں اس معاملے میں پھر آبا جان سے کچھ کہنے نہ جاؤں گی۔ (بخاری و مسلم)

انسانی ہمدردی

خیر الخلائق رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت نے سیدۃ فاطمۃ الزہراؑ کے دل میں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ وہ بیحد مصروف خاتون تھیں۔ خانہ داری، بچوں کی نگہداشت، شوہر کی خدمت اور عبادت سے انہیں کسی دوسری طرف توجہ کرنے کی فرصت بالکل نہ ملتی تھی لیکن وہ حضورؐ کے ارشاد اَحْسَنُ النَّاسِ خَادِمُ النَّاسِ (لوگوں میں سب سے بہتر وہ انسان ہے جو دوسروں کی خدمت بجا لاتا ہے) کے پیشِ نظر ہر وقت مخلوقِ خدا کی خدمت پر کمر بستہ رہتی تھیں اور اڑوسیوں پڑوسیوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

ان کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا جو اسلام کا سخت دشمن تھا! اللہ نے اسے ہدایت دی اور وہ مشرف بہ ایمان ہوگیا۔ اس پر اس کے خویش و اقارب اس کے مخالف ہوگئے اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اس طرح اس کے کاروبار اور تجارت پر بہت برا اثر پڑا اور وہ نہایت مفلس و قلاش ہوگیا۔ اسی زمانے میں اس کی ہمدرد اور غمگسار بیوی قضائے الٰہی سے فوت ہوگئی۔ رشتہ داروں میں سے کوئی اس کے قریب بھی نہ پھٹکا۔ گھر میں بیوی کی میت پڑی تھی اور وہ پریشان تھا کہ اس کے غسل و کفن کا کیا انتظام کیا جائے۔ اتفاق سے سیدہ فاطمۃ الزہراؑ کو اس کی مصیبت کا علم ہوگیا۔ وہ رات کے اندھیرے میں اٹھیں، ردائے مبارک سر پر لی اور لونڈی (حضرت فضہؓ) کو ساتھ لے کر

اس کے گھر پہنچیں، وہاں جاکر خود ہی میت کو غسل دیا اور خود ہی کفنایا۔

(خاتونِ جنّت۔ منشی تاج الدین احمد تاج مرحوم)

ایک مرتبہ چکی پیس رہی تھیں کہ پڑوس سے ایک دردناک آواز کانوں میں پڑی۔ یہ آواز سنتے ہی بے چین ہوگئیں۔ کنیز کو ساتھ لے کر فوراً اس گھر میں چلی گئیں، دیکھا کہ پڑوسن دردِ زہ میں مبتلا ہے اور اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ گھر والے سخت پریشان ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سیّدہؓ نے انہیں تسلی دی اور کنیز کے ساتھ مل کر زچہ کی اس تندہی سے مدد اور خدمت کی کہ بچہ صحیح سلامت پیدا ہوگیا اور زچہ کی جان بھی بچ گئی۔ یہ خدمت انجام دے کر گھر لوٹیں تو اس قدر خوش تھیں گویا سارے جہان کی نعمتیں مل گئی ہوں۔

(سیرت فاطمۃ الزہراؓ۔ مولانا عبدالمجید سوہدری مرحوم)

رسولِ پاک کی فرمانبرداری

سیدہ فاطمۃ الزہرا ؑ ایک مسلمان خاتون ہونے کی حیثیت سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ کی اُمت کا ایک فرد بھی تھیں اور حضورؐ کی چہیتی بیٹی بھی تھیں۔ ان دونوں حیثیتوں میں وہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتی تھیں وہ ہر کام میں حضورؐ کی پیروی کرتیں، ہر عمل اسی طرح سرانجام دیتیں جس طرح حضورؐ سرانجام دیتے۔ حضورؐ سے کوئی مسئلہ، حکم یا ارشاد سن پاتیں تو اس کو حرزِ جان بنا لیتیں اور اسی کے مطابق عمل کرتیں۔

ایک دفعہ حضرت علیؑ کو کہیں سے کچھ رقم مل گئی (قیاس یہ ہے کہ مالِ غنیمت سے ملی ہوگی) انہوں نے اس رقم سے سونے کا ایک ہار خرید لیا اور اسے سیدہ فاطمہؑ کو دے دیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ کو معلوم ہوا تو آپؐ بیٹی کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ کہلانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ) کی بیٹی آگ کا ہار پہنتی ہے۔"

دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہؑ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا:

"فاطمہ تم یہ ہار پہنے ہوئے ہو لوگ دیکھیں گے تو کیا یہ نہ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ) کی بیٹی مغرور امیروں کے سے زیور پہنتی ہے۔"

حضرت فاطمہؓ نے حضورؐ کا ارشاد سنا تو اسی وقت ہار گلے سے اتار دیا پھر اس کو فروخت کر کے ایک غلام خریدا اور اس کو آزاد کر دیا۔

محدثین نے یہ تصریح نہیں کی کہ حضورؐ نے "سونے کے ہار" کو "آگ کا ہار" کیوں قرار دیا، حالانکہ عورتوں کے لیے سونے کے زیور پہننا جائز ہے۔ قیاس یہ ہے کہ حضورؐ کو یہ پسند نہ تھا کہ آپؐ کے گھرانے کے لوگ پر تکلف لباس پہنیں یا قیمتی زیور استعمال کریں اور نمود و نمائش سے کچھ واسطہ رکھیں۔

ایک مرتبہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے۔ سیّدہ فاطمہؓ نے آپؐ کی مراجعت کی خوشی میں یا خیر مقدم کے طور پر گھر کے دروازے پر نقشیں پردہ لٹکا دیا[1] اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو چاندی کے کنگن پہنائے۔ حضورؐ معمول کے مطابق سب سے پہلے سیّدہ فاطمہؓ سے ملنے تشریف لائے۔ آپؐ نے گھر کے دروازے پر پردہ اور بچوں کے ہاتھ میں نقرئی کنگن دیکھے تو سیّدہؓ کے گھر میں داخل ہوئے بغیر واپس تشریف لے گئے۔ سیّدہؓ حضورؐ کی واپسی کا سبب سمجھ گئیں انہوں نے فوراً پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے، وہ روتے ہوئے نانا جانؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

"یہ میرے گھرانے والے (اہلِ بیت) ہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف (زرق برق آرائش) سے آلودہ ہوں۔ ان کے بدلے فاطمہؓ کے لیے عصیب کا ہار اور نقرئی کنگنوں کی جگہ ہاتھی دانت

---

[1] بعض روایتوں میں ایک سے زیادہ پردے بیان کیے گئے ہیں جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

کے دو جوڑے کنگن خرید لاؤ۔ (ابوداؤد و نسائی)

ایک اور روایت میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے پاس باہر سے کچھ رقم بھیجی۔ اس زمانے میں حضورؐ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو سیدہ فاطمہؓ نے اس خوشی میں حضرت علیؓ کی بھیجی ہوئی رقم سے ایک پردہ خرید کر دروازے پر لٹکا دیا اور چاندی کے دو کنگن بنوا کر ہاتھوں میں پہن لیے۔ حضورؐ واپس تشریف لائے تو حسبِ معمول سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ سے ملنے گئے۔ انہوں نے نہایت مسرت سے حضورؐ کو اہلاً وسہلاً و مرحبا کہا لیکن حضورؐ نے دروازے پر پردہ اور ان کے ہاتھوں میں چاندی کے کنگن دیکھ کر ان کی طرف چنداں التفات نہ فرمایا اور کاشانۂ فاطمہؓ میں تشریف رکھے بغیر واپس چلے گئے۔ حضرت فاطمہؓ کو حضورؐ کی بے اعتنائی سے بہت دکھ ہوا، وہ رونے لگیں اور سوچنے لگیں کہ آخر مجھ سے کونسا کام حضورؐ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے؟ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ یہی پردہ اور کنگن دو نئی چیزیں گھر میں آئی ہیں۔ انہوں نے فوراً کنگن ہاتھوں سے نکالے اور دروازے سے پردہ اتارا پھر یہ دونوں چیزیں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو دے کر فرمایا کہ انہیں نانا جان کے پاس لے جاؤ اور میری طرف سے عرض کرو کہ آپ ان کو جس طرح چاہیں، کام میں لائیں۔

بچے یہ چیزیں لے کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور ماں کا پیغام دیا تو آپؐ نے ان کو چوم کر اپنے زانوؤں پر بٹھا لیا اور صحابہؓ کو حکم دیا کہ کنگنوں کو توڑ کر اور پردے کو بہت سے حصوں میں پھاڑ کر انہیں اصحابِ صفہؓ میں تقسیم کر دو۔ اس کے بعد آپؐ نے دعا کی:۔

"الٰہی! میری بیٹی فاطمہ کو اپنے فضل و کرم سے نواز۔ اس پردے کے بدلے جس سے صُفّہ کے محتاجوں کا تن ڈھانکا گیا، میری بیٹی کو جنت کے کپڑے عطا فرما اور ان کنگنوں کے بدلے جو ان غریب لوگوں میں تقسیم کیے گئے، اسے جنت کے زیور پہنا۔"
(اسوۂ حسنہ۔ سلمان منصور پوری)

غرض سیدہ فاطمۃ الزہراؑ ہمیشہ حضورؐ کی مرضی اور منشا کے مطابق عمل کرتی تھیں اور آپؐ کی رضا جوئی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتی تھیں۔

باپ بیٹی کی محبت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیّدہ فاطمۃ الزہرا ؑ سے بے انتہا محبت تھی اور سیدہ ؑ بھی حضور ؐ سے والہانہ محبت کرتی تھیں۔ خادمِ رسول اللہ ؐ حضرت انس ؓ بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو اپنی اولاد سے محبت کرتے نہیں دیکھا۔ جب کبھی آپ ؐ سفر پر تشریف لے جاتے تو حضرت فاطمہ ؑ سے مل کے جاتے اور جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے سیدہ فاطمہ ؑ سے آکر ملتے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت ہے کہ جب فاطمہ ؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آپ ؐ ازراہِ محبت کھڑے ہو جاتے اور شفقت سے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی نشست سے ہٹ کر اپنی جگہ پر بٹھاتے اور جب آپ ؐ فاطمہ ؑ کے گھر تشریف لے جاتے تو وہ بھی کھڑی ہو جاتیں، محبت سے آپ ؐ کا سر مبارک چومتیں اور اپنی جگہ پر بٹھاتیں۔

(ابوداؤد)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان ؓ کہتے ہیں کہ حضور ؐ کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں سیدہ فاطمہ ؑ سے رخصت ہوتے اور سفر سے واپس تشریف لاتے تو خاندان بھر میں سب سے پہلے سیدہ فاطمہ ؑ ہی سے ملاقات کرتے پھر اپنے گھر تشریف لے جاتے۔

(مدارج النبوۃ)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ حضرت فاطمہؓ کے ہر رنج و راحت میں شریک ہوتے اور تقریباً ہر روز ان کے گھر جاتے۔ ان کی خبر گیری کرتے، کوئی تکلیف ہوتی تو اسے دور کرنے کی کوشش فرماتے —— اگر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں فقر و فاقہ ہوتا تو بیٹی کے گھر میں بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ حضورؐ کے گھر میں کوئی چیز پکتی تو آپؐ اس میں سے کچھ نہ کچھ حضرت فاطمہؓ کو بھی بھجواتے۔ اگر کہیں سے کوئی کھانے پینے کی چیز آجاتی تو آپؐ اس میں سے بھی سیدہ فاطمہؓ کا حصہ ضرور نکالتے اور ان کو بھجوا دیتے کہیں سے کپڑا آتا تو وہ بھی بقدرِ مناسب سیدہؓ کو بھیجتے۔ اگر کہیں دعوت پر تشریف لے جاتے اور سیدہؓ گھر میں بھوکی ہوتیں تو میزبان کی اجازت سے ان کے لیے کچھ کھانا بھیج دیتے۔

حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس تشریف لائے۔ پہلے آپؐ نے مسجد میں جاکر دو رکعت نماز پڑھی۔ حضورؐ کو یہ بات زیادہ پسند تھی کہ جب کبھی سفر سے واپس ہوتے پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرماتے اس کے بعد اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے پھر ازواجِ مطہرات کے یہاں۔ چنانچہ آپؐ دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد حضرت فاطمہؓ سے ملنے تشریف لے چلے۔ حضرت فاطمہؓ آپؐ کے استقبال کے لیے گھر کے دروازہ پر آگئیں اور آپؐ کا چہرۂ مبارک چومنا شروع کر دیا۔ (بروایت دیگر آنکھ اور دہن مبارک کو چوما) اور رونے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا روتی کیوں ہو؟ عرض کیا، آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ مشقت سے متغیر اور پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر

رونا آگیا۔ آپؐ نے فرمایا، اے فاطمہ گریہ وزاری نہ کر تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے کام کے لیے بھیجا ہے کہ روئے زمین پر کوئی اینٹ اور گارے کا مکان اور نہ کوئی ادنیٰ سوتی خیمہ بچے گا جس میں اللہ تعالیٰ یہ کام (دینِ اسلام) نہ پہنچا دے اور یہ دین وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک دن اور رات کی پہنچ ہے ———— (کنز العمال۔ طبرانیؒ، ہیثمیؒ۔ حاکمؒ)

مُسندِ احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت فاطمہؓ نے (جب انہیں معلوم ہوا کہ حضورؐ فاقہ سے ہیں) جَو کی روٹی کا ایک ٹکڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا، جانِ پدر یہ پہلا کھانا ہے جس کو تین دن کے بعد تیرا باپ کھائے گا۔ طبرانی میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ نے آپؐ کو جَو کی روٹی کا ٹکڑا دیا تو آپؐ نے پوچھا، بیٹی یہ کیا ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا، ابا جان، یہ ٹکیہ ہے جس کو میں نے پکایا تھا، میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں اکیلی یہ ٹکیہ کھاؤں (درآنحالیکہ آپ بھوکے ہوں)۔ اس میں سے یہ ٹکڑا آپؐ کی خدمت میں لائی ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ خندق (۵ ہجری) میں گھر کے مرد میدان میں تھے۔ ایک دن سیدہ فاطمہؓ نے روٹی پکائی اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کو پیش کی۔ حضورؐ کئی دن سے خندق کی کھدائی میں مصروف تھے۔ بیٹی کی محبت پر خوش ہو کر فرمایا، جانِ پدر آج تین دن کے بعد یہ لقمہ مجھے ملا ہے۔

غزوۂ اُحد (۳ ہجری) میں سرورِ عالم ﷺ زخمی ہوئے تو بعض لوگ سمجھے کہ آپؐ شہید ہو گئے۔ یہ خبر مدینے پہنچی تو خواتین فرطِ غم سے نڈھال ہو گئیں اور بے اختیار گھروں سے نکل پڑیں۔ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بھی ان میں شامل تھیں۔ وہ میدانِ جنگ میں پہنچیں تو دیکھا کہ سرورِ عالم ﷺ زخمی ہیں اور چہرۂ مبارک اور سرِ اقدس سے خون جاری ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ڈھال میں پانی بھر کر لائے اور حضرت سیدہؓ زخم دھونے لگیں۔ پانی ڈالنے سے خون زیادہ بہنے لگا۔ چنانچہ سیدہؓ نے پانی ڈالنا بند کر دیا۔ چٹائی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے جلایا اور اسے زخم میں بھر دیا۔ اس طرح خون بند ہو گیا۔

اس سلسلہ میں کچھ روایتیں اس قسم کی بھی ملتی ہیں کہ:—

(ا) سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کی معیت میں میدانِ جنگ میں تشریف لے گئیں اور وہاں مجاہدین (زخمیوں) کو پانی پلاتی رہیں، اور ان کی مرہم پٹی کرتی رہیں۔

(ب) حضورؐ زخمی ہوئے تو سیدہ فاطمہؓ نے آپؐ کے روئے مبارک کے زخم کو صاف کر کے مرہم پٹی کی۔

(ج) غزوۂ اُحد کے وقت سیدنا حضرت حسنؓ کی ولادت کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور وہ سیدہ فاطمہؓ کی گود میں تھے اس کے باوجود وہ حضورؐ کے زخمی ہونے کی خبر سنتے ہی میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ آپؐ کے زخم دھوئے اور مرہم پٹی کی۔

---

۸ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ فتح مکہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہؓ بھی آپؐ کے ساتھ

مکہ گئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں ان کی موجودگی کا ثبوت اس روایت سے ملتا ہے:۔

"اُمِّ ہانیؓ کہتی ہیں کہ جب مکہ فتح ہو گیا (اور حضورؐ ابھی مکہ ہی میں تھے) کہ (ایک دن) فاطمہؓ آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب بیٹھ گئیں اور میں آپ کی دائیں جانب تھی۔ پس ایک لونڈی ایک برتن لے کر حاضر ہوئی جس میں پینے کی کوئی چیز تھی۔ لونڈی نے وہ برتن آپؐ کو دے دیا۔ آپؐ نے تھوڑا سا پی لیا اور پھر مجھے دے دیا میں نے اس کو پی لیا اور اور پھر عرض کیا، یارسول اللہ میں روزہ سے تھی اور میں نے پی لیا، آپؐ نے پوچھا، کیا تم نے کوئی قضا روزہ رکھا تھا؟ میں نے کہا نہیں آپؐ نے فرمایا، اگر یہ روزہ نفل تھا تو کچھ حرج نہیں۔

(مشکوٰۃ شریف بحوالہ مسند ابوداؤد، مسند دارمی، ترمذی)

ذیقعدہ ۱۰ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بھی آپؐ کے ہمرکاب تھیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس زمانے میں نجران (یمن) گئے ہوئے تھے۔ مکہ پہنچ کر حضرت فاطمہؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمرہ ادا کیا اور آپؐ کے حکم سے احرام کھولا۔ اسی وقت حضرت علیؓ نجران سے مکہ معظمہ پہنچے۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ سے احرام کھولنے کا سبب پوچھا۔ سیدہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے گیہوں کی پیداوار سے (جو خیبر، فدک وغیرہ

کی زمینوں سے حاصل ہوتی تھی) حضرت فاطمہؓ کا خاص حصہ مقرر فرمایا تھا۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ایک تحریری فرمان کے ذریعہ حضرت فاطمہؓ کا حصہ پچاسی وسق گندم مقرر فرمایا تھا۔ اس فرمان پر حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت عباسؓ کی گواہی تھی۔ اس میں ازواجِ مطہراتؓ، حضرت اسامہؓ بن زیدؓ (حِبُّ النبیؐ) حضرت مقدادؓ بن الاسود اور امِ رمیشہؓ کے حصے بھی مقرر کیے گئے تھے۔

حضرت زیدؓ بن ارقم سے روایت ہے کہ بعض صحابہؓ کے گھروں کے دروازے مسجدِ نبوی میں کھلتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حکم دیا کہ فاطمہؓ کے گھر کے سوا ایسے تمام دروازے بند کر دیے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صرف حضرت فاطمہؓ کے گھر کا دروازہ باقی رکھا گیا۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ، آپؐ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا فاطمہؓ سے؟ حضورؐ نے فرمایا، فاطمہؓ مجھے تم سے زیادہ محبوب ہے اور تم مجھے فاطمہؓ سے زیادہ عزیز ہو۔

اعزّہ و اقربا کی محبّت

اسلام میں صلۂ رحمی کی بہت تاکید کی گئی ہے اور خویش و اقارب سے حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ سیّدہ فاطمۃُ الزہراءؓ ایک سچی مؤمنہ تھیں اس لیے وہ اپنے تمام اعزّہ و اقربا سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان سے حسنِ سلوک اور احسان و مروّت سے پیش آتی تھیں۔ اپنی خوشدامن حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کو حقیقی ماں کی طرح جانتی تھیں اور دل و جان سے ان کی خدمت کرتی تھیں خود حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کا بیان ہے:۔

"جس قدر میری خدمت فاطمہؓ نے کی ہے شاید ہی کسی بہو نے اپنی ساس کی اتنی خدمت کی ہو۔"

حضرت فاطمہؓ کی بہن سیّدہ رقیہؓ نے ۲ ہجری میں وفات پائی تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے سلسلہ میں مدینہ منورہ سے باہر تھے۔ آپؐ واپس تشریف لائے تو حضرت رقیہؓ کی قبر پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر سیّدہ فاطمہؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھیں وہ قبر کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کپڑے سے ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور تسلی دیتے جاتے تھے۔

سیّدہ فاطمہؓ کے چچا حضرت جعفرؓ بن ابی طالب (حضرت علیؓ کے حقیقی اور حضورؐ کے چچا زاد بھائی) نے غزوۂ مُوتہ میں شہادت پائی تو ان کو شدید صدمہ ہوا۔ ان کی شہادت کی خبر سن کر وہ "واعماہ واعماہ" (ہائے میرے

چچا ہائے میرے چچا) کہہ کر روتی ہوئی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں آپؐ نے باچشم پُرنم فرمایا:

"بے شک جعفر جیسے شخص پر رونے والیوں کو رونا چاہیئے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا "دیکھو بیٹی زبان سے کچھ نہ کہنا اور نہ سینہ کوبی کرنا۔" اس کے بعد حضورؐ نے اپنی لخت جگر سے فرمایا:

"فاطمہ! جعفر کے بچوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ اسماء (بنت عمیس زوجہ حضرت جعفرؓ) آج سخت غمزدہ ہے۔"

صحیح بخاری میں ہے کہ ذیقعدہ ۷ھ ہجری میں حضورؐ عمرۃ القضا کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ صلحنامہ حدیبیہ کی شرط کے مطابق تین دن کے قیام کے بعد آپؐ مکہ سے چلنے لگے تو آپؐ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ (شہید اُحد) کی کمسن صاحبزادی اُمامہؓ "یا عَمّ یا عَمّ" (اے چچا اے چچا) کہتی ہوئی حضورؐ کی طرف دوڑیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت وہ یا اخی یا اخی یعنی اے بھائی اے بھائی کہہ رہی تھیں۔ (فی الحقیقت حضرت حمزہؓ حضورؐ کے رضاعی اور خالہ زاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی۔ اس لیے آپؐ اُمامہؓ کے چچا بھی ہوتے تھے اور بھائی بھی۔)

اس موقع پر حضرت علیؓ حضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ انہوں نے اُمامہؓ کو گود میں اٹھا لیا اور اپنے ساتھ لا کر حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے سپرد کر دیا کہ یہ تمہاری بنت عم ہے۔ سیدہ فاطمہؓ نے ان کو بڑے لطف و محبت کے ساتھ اپنے پاس رکھ لیا لیکن بعد میں انہوں نے حضورؐ کے حکم کے مطابق اُمامہؓ کو حضرت جعفرؓ کے سپرد کر دیا کیونکہ ان کی زوجہ اسماءؓ بنت عمیس امامہؓ کی حقیقی خالہ

تھیں (حضرت امامہؓ کی والدہ کا نام سلمٰی بنتِ عمیس تھا۔)

غرض حضرت فاطمۃُ الزّہراءؓ کے تمام اعزہ واقربا سے نہایت اچھے تعلقات تھے وہ ان سب کے ساتھ محبّت اور خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں اور ان کے ہر دُکھ سُکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ سب بھی سیدہؓ کی بڑی قدرومنزلت کرتے تھے اور ان سے بڑی محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

سوتیلی ماؤں سے تعلّق

حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی والدہ ماجدہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مکّہ معظّمہ میں ہی انتقال ہو چکا تھا (سنہ ۱۰ نبوّت)۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد حضرت سَودہؓ بنتِ زمعہ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ حضورؐ کے عقد میں آئیں۔ اپنی شادی سے پہلے سیدہ فاطمہؓ ان دونوں ماؤں کے ساتھ بڑے پیار اور محبت سے رہیں۔ آگے چل کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور کئی عقد کیے۔ اس وقت سیدہ فاطمہؓ کی شادی ہو چکی تھی تاہم ان کے تمام سوتیلی ماؤں سے نہایت اچھے تعلقات تھے۔ سبھی ماؤں کے نزدیک ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور سبھی ان سے بہت محبّت کرتی تھیں خصوصاً اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ کا ان سے خاص تعلقِ خاطر تھا۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے متعدد فضائل و مناقب حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی سے مروی ہیں۔

سیدہ فاطمہؓ کی شادی ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس کے اہتمام میں خاص حصہ لیا۔ وہ خود بیان فرماتی ہیں:-

"عقد کے بعد فاطمہؓ کے لیے ایک مکان تجویز کیا گیا۔ ہم نے بطحا کے کنارے سے نرم مٹی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اس میں بچھائی، فرش تیار کیا، لپائی کی، پھر کھجور کی چھال اپنے ہاتھوں سے توم کر دو تکیے تیار کیے، چھوہارے اور منقّے دعوت میں پیش کیے۔ لکڑی کی ایک الگنی تیار کی تاکہ اس پر پانی کی مشک اور کپڑے لٹکائے

جائیں ـــــ فاطمہؓ کے بیاہ سے کوئی اچھا بیاہ میں نے نہیں دیکھا۔

(ابنِ ماجہ)

شادی کے بعد حضرت فاطمہؓ جس مکان میں گئیں اس میں اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں صرف ایک دیوار کا فصل تھا۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس سے کبھی کبھی باہم بات چیت ہو جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدہ فاطمہؓ لونڈی کی درخواست کے لیے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آئیں لیکن اتفاق سے باریابی نہ ہوئی تو وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی کو وکیل بنا کر واپس چلی گئیں۔

ایک مرتبہ ایک تابعی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا:

"اے ہماری ماں یہ تو بتایئے رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا؟"

فرمایا: "فاطمہ"

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور دونوں میں بڑی محبت اور میل ملاپ تھا۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان دونوں کے دل باہم صاف نہیں تھے۔ ان کے اس اِدّعا کی تائید میں کوئی ایک بھی مستند اور صحیح حدیث موجود نہیں ہے۔
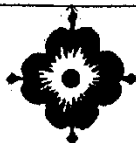
نواسوں اور نواسیوں سے حضورؐ کی محبت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسوں اور نواسیوں سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ سیدہ زینبؓ کی صاحبزادی امامہؓ اور فرزند علیؓ سے آپ کو جس قدر پیار تھا اس کا حال حضرت زینبؓ کے سوانح حیات میں آچکا ہے۔ اسی طرح سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے بچوں سے بھی آپؐ کو قلبی لگاؤ تھا۔ سیدنا حضرت حسنؓ پیدا ہوئے تو حضورؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ نومولود کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور اس کے کان میں اذان دی اس کے بعد اسے اپنا لعابِ دہن چٹایا۔ حضرت علیؓ نے ان کا نام حرب رکھنے کا ارادہ کیا تھا حضورؐ نے فرمایا، نہیں اس کا نام حسن رکھو۔ آپؐ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا:

"میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے۔"

ایک اور موقع پر فرمایا:

"یہ جنت میں میرا خوشبودار پھول ہے۔"

سیدنا حضرت حسینؓ کی ولادت پر بھی حضورؐ سیدہ فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے کانوں میں اذان دی۔ ان کا نام بھی حرب تجویز کیا گیا تھا لیکن حضورؐ نے حسینؓ رکھا۔

بارگاہِ رسالت میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ آپ فرماتے تھے:

"حسنؓ اور حسینؓ میرے بیٹے، میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ اے اللہ

میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان کو اپنا محبوب بنا اور جو ان سے محبت کرے تو بھی اس سے محبت کر۔"

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

"حسن اور حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔"

حضورؐ حسنینؑ کو کبھی گود میں لے کر اور کبھی دوشِ مبارک پر بٹھا کر باہر نکلتے۔ ان کی معمولی سی تکلیف پر بھی مضطرب ہو جاتے اور ان کو دیکھنے کے لیے روزانہ حضرت فاطمہؑ کے گھر قدم رنجہ فرماتے۔ دونوں بچے نماز کی حالت میں کبھی حضورؐ کی پشت مبارک پر بیٹھ جاتے، کبھی رکوع کی حالت میں دونوں ٹانگوں کے بیچ میں گھس جاتے، کبھی ریش مبارک سے کھیلتے حضورؐ ان کو کبھی نہ جھڑکتے اور ہنس دیتے۔

ایک دن حضورؐ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے کہ حسنینؑ اتفاق سے وہاں آ گئے۔ دونوں بہت کمسن تھے اور لڑکھڑا کر چل رہے تھے۔ حضورؐ نے انہیں دیکھا تو منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دونوں کو گود میں اٹھا لیا پھر اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا:

"اللہ نے سچ کہا ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد آزمائش (فتنہ) ہی تو ہیں۔ میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا کہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے میں نے انہیں اٹھا لیا۔"

ایک دفعہ حضرت حسنؑ (بروایت دیگر حضرت حسینؑ) حضورؐ کے قدم مبارک پر اپنا قدم رکھ کر کھڑے تھے۔ آپؐ نے ان کے قدم اپنے سینۂ مبارک پر رکھ لیے اور منہ چوم کر فرمایا:

"خدایا میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ۔"
حضورؐ سیدہ فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے، میرے بچوں کو لاؤ۔ وہ لاتیں تو آپؐ ان کو سینہ سے لپٹاتے اور ان کا منہ چومتے۔
ایک دن حضورؐ کسی دعوت میں شریک ہونے کے لیے گھر سے نکلے حسینؓ گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضورؐ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلائے ننھے حسینؓ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ آپؐ بھی ہنستے ہنستے ان کے پیچھے ہو لیے۔ یہاں تک کہ انہیں پکڑ لیا، پھر آپؐ نے ان کا ہاتھ اپنی گدّی کے نیچے اور دوسرا ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا اور فرمایا :۔

"حسینؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں اللہ اس شخص سے محبت کرے جس نے حسینؓ سے محبت کی۔"

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں :

"میری ان دونوں آنکھوں نے دیکھا ہے اور ان دو کانوں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسینؓ کے دونوں کندھے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں رسول اللہؐ کے پاؤں پر تھے، آپؐ فرما رہے تھے ترق ترق عین بقہ (اے ننھے مُنّے بالشت) یہ کہہ کر آپؐ نے حسینؓ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا یہاں تک کہ اُن کے پاؤں آپؐ کے سینہ پر لگنے لگے۔ آپؐ نے ان سے کہا "منہ کھولو" انہوں نے منہ کھول دیا۔ آپؐ نے انہیں پیار کیا اور فرمایا:
اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔"
(طبریؒ)

حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کسی ضرورت سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ کوئی چیز چادر میں لپیٹے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب میں اپنی ضرورت بیان کر چکا تو آپؐ سے دریافت کیا :

" یا رسول اللہ یہ آپ کیا لپیٹے ہوئے ہیں ؟"

آپؐ نے کپڑا اٹھایا تو اس میں سے حسنؑ اور حسینؑ ظاہر ہوئے جو آپؐ کی گود میں چڑھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا :

" یہ دونوں میرے بیٹے، میری بیٹی کے لختِ جگر ہیں۔ اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو بھی ان دونوں سے اور ہر اس شخص سے جو ان سے محبت کرتا ہے محبت کر۔"

(ترمذی)

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا، میرے بیٹوں کو میرے پاس لاؤ۔ جب وہ دونوں (حسنؑ اور حسینؑ) آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے انہیں سینے سے چمٹا لیا۔ (ترمذی)

سیدہ فاطمہؑ کے بچوں سے حضورؐ کی محبت اور شفقت کے اور بھی بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔

ابوسفیانؓ کی بارگاہِ سیدہؑ میں حاضری

۸ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ پر لشکر کشی کرنے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش مکہ کے حلیف قبیلہ بنو بکر نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر بلا وجہ حملہ کیا تھا اور ان کے بہت سے افراد کو قتل کر ڈالا تھا۔ یہاں تک کہ حرم کعبہ میں پناہ لینے والوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس ظالمانہ کام میں خود مشرکین مکہ نے بنو بکر کی مدد کی تھی۔ یہ بات صلحنامہ حدیبیہ کی صریح خلاف ورزی تھی۔ حضورؐ نے ایک قاصد بھیج کر اہل مکہ سے اس قتل و غارت کا سبب پوچھا، تو ان کے بعض نوجوانوں نے نہایت گستاخانہ جواب دیا اور قاصد کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ہم نہیں جانتے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کون ہے۔

جب حضورؐ کا قاصد واپس آگیا تو مشرکین کے بڑے بوڑھوں اور سربرآوردہ آدمیوں نے محسوس کیا کہ ہم سے سخت غلطی ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے کیا ہے ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ انہوں نے ابوسفیان کو (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اس غرض سے مدینہ منورہ بھیجا کہ وہ جاکر مسلمانوں سے دوبارہ معاہدۂ صلح کی کوشش کریں تاکہ قریش کو کسی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ابوسفیانؓ نے مدینہ پہنچ کر پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات کی اور ان سے مدد کی درخواست کی لیکن ان دونوں بزرگوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابوسفیانؓ حضرت فاطمہؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے التجا کی کہ وہ اپنے اثر سے کام لے کر

قریش مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے معافی دلا دیں اور حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو حکم دیں کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ ہم نے اہل مکہ کو امن دے دیا ہے۔ سیدہ فاطمۃ الزہراؑ اپنے والد گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ کی مزاج شناس تھیں۔ انہوں نے اس معاملے میں دخل دینے سے بالکل انکار کر دیا اور فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی مرضی اور ایماء کے بغیر ہم میں سے کوئی شخص نہ کسی کو امن دے سکتا ہے اور نہ کسی سے صلح کر سکتا ہے۔"

اس پر ابوسفیانؓ مایوس ہو گئے اور یک طرفہ تجدیدِ صلح کا اعلان کر کے واپس چلے گئے۔

سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ بنت محمدؐ کی مثال دی

فتح مکہ کے موقع پر بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہ نامی سے چوری کی لغزش سرزد ہوگئی اور وہ پکڑی گئی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر شریعت کے مطابق حد جاری کرنے (یعنی اس کا ہاتھ کاٹنے) کا حکم دیا۔ اس کے اقربا اور اہلِ قبیلہ نے حِبُّ النبیؐ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں بھیجا کہ وہ اس عورت کی سفارش کریں۔ حضرت اسامہؓ نے حضورؐ سے اس عورت کی خطا بخشی کی درخواست کی تو آپؐ کو ان کی سفارش ناگوار گزری اور آپؐ نے حضرت اسامہؓ سے فرمایا:۔

"کیا تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے بارے میں (رعایت کی) گفتگو کرتے ہو؟"

حضورؐ کا ارشاد سن کر حضرت اسامہؓ کانپ اٹھے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، میرے لیے مغفرت طلب فرمائیے۔"

شام ہوئی تو حضورؐ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"اما بعد پہلے لوگ (بروایتِ دیگر بنو اسرائیل) اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف (معزز یا امیر) آدمی چوری کرتا تھا اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں کوئی کمزور (معمولی)

آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم اس ذات کی جس کے
قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؑ بنت محمدؐ بھی
چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

اس کے بعد فاطمہ مخزومیہ پر حد جاری کی گئی۔ ہاتھ کٹنے کے بعد ان کی زندگی میں یکسر انقلاب آگیا۔ انہوں نے توبہ کی اور اس کو نہایت پرہیزگاری اور استقامت کے ساتھ نباہا۔

اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؑ بنت محمدؐ کی جو مثال دی اس سے آپؐ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ فاطمہؑ جو میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور مجھ کو بے حد محبوب ہے، حدود اللہ کے معاملے میں اس کی رعایت بھی مجھے منظور نہیں ہے۔

واقعۂ مباہلہ

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب اپنے وطن اور گھر بار کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو گلشنِ اسلام میں بہارِ تازہ آگئی۔ چند سال پہلے وادیٔ بطحا سے جو صدائے حق بلند ہوئی تھی وہ اب روز بروز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ یمن و بحرین اور حضر موت سے حدودِ شام تک پھیلے ہوئے لاکھوں مربع میل علاقے میں گھر گھر تک پہنچ گئی۔ معبودانِ باطل کے پجاریوں نے جب دیکھا کہ شمعِ رسالت کے پروانوں کی تعداد میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو ان پر ہیبتِ حق طاری ہوگئی اور وہ ذیلئے عرب کے کونے کونے سے اپنے علاقوں اور قبیلوں کے نمائندہ وفد بنا کر جوق در جوق بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے لگے کچھ اسلام قبول کرنے کے لیے، کچھ دعوتِ اسلام قبول کرنے کے بعد احکامِ دین سیکھنے اور حضورؐ کی زیارت و بیعت کا شرف حاصل کرنے کے لیے اور کچھ صلح و امن کا معاہدہ کرنے کے لیے۔ وفود (سفارتوں) کا یہ سلسلہ ۵ سنہ ہجری میں شروع ہوا اور وصالِ نبویؐ سے چار ماہ قبل تک جاری رہا۔ فتح مکہ (۸ سنہ ہجری) کے اگلے سال تو اس کثرت سے وفود آئے کہ ۹ سنہ کا نام ہی سال الوفود پڑ گیا۔ ان تمام وفود کی تعداد کے بارے میں اہلِ سیر میں اختلاف ہے۔ انہوں نے پندرہ سے لے کر ایک سو چار وفود تک کا حال لکھا ہے۔ ان میں سے وفدِ نجران کا ذکر تمام اہلِ سیر نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے کیونکہ اسی وفد سے گفتگو یا بحث کے دوران میں مباہلہ کا واقعہ پیش آیا تھا۔

نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو سارے عرب میں عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز تھی (بعض مؤرخین کے مطابق یہ ریاست حدودِ یمن میں واقع تھی۔ اس ریاست کا یمن کی حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ یہ براہِ راست قیصرِ روم کے ماتحت تھی) نجران کا علاقہ نہایت سرسبز اور شاداب تھا اور اس کے باشندے جو عیسائی عرب تھے صنعت و حرفت اور تجارت کی بدولت بڑے خوشحال تھے۔ یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان گرجا تھا جو کعبۂ نجران کے نام سے مشہور تھا۔ ریاست کا نظم و نسق تین شعبوں میں منقسم تھا۔ ہر شعبے کا اعلیٰ عہدے دار الگ تھا۔ دینی معاملات کا افسرِ اعلیٰ "استقف" کہلاتا تھا۔ خارجی اور جنگی امور کا نگران سید اور داخلی امور کا نگران "عاقب" کہلاتا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو ایک نامۂ مبارک بھیجا جس میں انہیں دعوتِ اسلام دی گئی تھی۔ ان لوگوں نے اسلام تو قبول نہیں کیا البتہ ساٹھ آدمیوں کا ایک وفد ۹ھ ہجری میں تحقیقِ احوال کے لیے مدینہ منورہ بھیجا[1]۔ اس وفد میں استقف، سید اور عاقب سمیت نجران کے بڑے بڑے معززین اور شرفاء شامل تھے۔ ان لوگوں کے لیے مسجدِ نبوی کے صحن میں خیمے لگا دیئے گئے اور انہوں نے وہیں قیام کیا۔ یہ لوگ غالباً اتوار کے دن مدینہ منورہ پہنچے تھے جو اُن کا یومِ عبادت تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طریقے پر مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنی چاہی تو صحابہؓ نے اعتراض کیا ـــــ حضورؐ نے فرمایا: ـــــ "پڑھنے دو۔"

---

[1] ایک دوسری روایت کے مطابق وفدِ نجران سنہ ۱۰ھ میں مدینہ منورہ آیا۔

اجازت ملنے پر انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے اپنی نماز پڑھی۔ ان لوگوں نے خاصی مدت مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ اس دوران میں حضورؐ ان کو برابر حق کی طرف بلاتے رہے اور ان کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب وحی کی رو سے دیتے رہے لیکن ان لوگوں کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی — "میں نہ مانوں۔"

مفسّرین نے لکھا ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی ابتدائی اسّی آیات وفدِ نجران کے قیام کے دوران میں ہی نازل ہوئی۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو کہنے لگے کہ ہم تو پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم لوگ صلیب کے پجاری ہو اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو حالانکہ ان کی حالت اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم علیہ السلام جیسی تھی اور وہ بھی ان کی طرح مٹی سے پیدا کیے گئے تھے پھر وہ خدا کس طرح ہو گئے۔ اہلِ وفد نے ہادیٔ برحقؐ کی کوئی بات نہ مانی اور برابر کٹ حجتیاں کرتے رہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ۔ (آلِ عمران: ع ۶)

(اور جو کوئی تم سے علم آئے پیچھے بھی جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بچوں، مردوں اور عورتوں کو بلا لیتے ہیں تم اپنے بچوں، مردوں اور عورتوں کو بلاؤ پھر ان کے ساتھ ہم اور تم اللہ سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو)

چنانچہ اتمامِ حجت کے طور پر حضورؐ حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت حسنؓ اور

حضرت حسینؓ کو ساتھ لے کر عیسائیوں سے مباہلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی اپنے ساتھ لیا تھا۔ آپؐ کے پیچھے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ تھیں اور ان کے پیچھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضورؐ نے ان چاروں کو ہدایت فرما دی تھی کہ میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ اس وقت ان نفوسِ قدسی کے چہروں سے حق کا ایسا رعب اور جلال ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کو دیکھتے ہی وفد کے ارکان کانپ اٹھے اور ان کے سرداروں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر یہ واقعی نبی ہیں تو ہم مباہلہ کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد اور ملعون ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہم نہ مباہلہ کرتے ہیں اور نہ اسلام قبول کرتے ہیں البتہ ہمیں جزیہ دینا منظور ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ایک دیانت دار آدمی کو بھیج دیں جس کو ہم خراج کی رقم جو آپ مقرر کریں گے ادا کر دیا کریں گے۔ حضورؐ نے اُن کی بات مان لی اور فریقین کے مابین اسی کے مطابق معاہدۂ صلح پا گیا۔ جب یہ وفد رخصت ہونے لگا تو حضورؐ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو خراج کی وصولی کے لیے اس کے ساتھ بھیج دیا اور فرمایا:
"یہ ہماری اُمت کے امین ہیں۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ نجران سے یکے بعد دیگرے دو وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پہلا وفد تین آدمیوں پر مشتمل تھا اور اسی وفد کے ساتھ بحث کے دوران میں آیاتِ مباہلہ نازل ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے مباہلہ نہ کیا اور جزیہ دینا قبول کر کے واپس چلے گئے۔ اس وفد کے بعد دوسرا وفد جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا، مدینہ منورہ آیا اور وہ بھی حضورؐ سے فرمانِ امن لے کر واپس گیا۔

سرورِ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وصال

سنہ ۱۱ ہجری میں حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ حضورؐ علیل ہوئے، جب علالت زیادہ بڑھ گئی تو ایک دن فاطمۃ الزہراؑ آپؐ کی خبر گیری کے لیے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرے میں تشریف لائیں[۱]۔ حضورؐ نے انہیں دیکھ کر فرمایا۔ مرحبا یا بنتی۔ (اے میری بیٹی خوش رہو) پھر نہایت شفقت سے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور ان کے کان میں آہستہ سے کوئی بات کہی جسے سُن کر وہ رونے لگیں پھر حضورؐ نے کوئی اور بات اُن کے کان میں فرمائی جسے سن کر وہ ہنسنے لگیں تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان سے پوچھا —— "اے فاطمہ تمہارے اباجانؐ نے تم سے چپکے سے کیا کہا؟" (یا بروایت دیگر اے فاطمہ تیرے رونے اور ہنسنے میں کیا بھید تھا؟"

سیّدہؓ نے جواب دیا، "جو بات حضورؐ نے اخفا میں رکھی ہے میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔"

سرورِ کونینؐ کے وصال کے بعد ایک دن حضرت عائشہ صدیقہؓ (اور بعض روایتوں کے مطابق حضرت اُمّ سلمہؓ) نے اصرار کے ساتھ سیدہ فاطمۃ الزہراؑ سے اس دن کے واقعہ کی تفصیل پوچھی تو سیّدہؓ نے فرمایا، "پہلی دفعہ حضورؐ

---

[۱] بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے خود سیدہ فاطمہؓ کو بُلا بھیجا تھا۔

نے فرمایا تھا کہ پہلے جبریلِ امینؑ سال میں ہمیشہ ایک بار قرآنِ مجید کا دَور کیا کرتے تھے۔ اس سال خلافِ معمول دوبار کیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میری وفات کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ یہ سن کر میں رونے لگی۔ پھر حضورؐ نے فرمایا تھا، تم میرے گھر والوں میں سب سے پہلے مجھے ملوگی اور تم جنّت کی عورتوں کی سردار ہوگی، اس بات سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔"

ایامِ علالت میں ایک دن (اور بعض روایتوں کے مطابق اپنی وفات کے دن) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدہ فاطمہؓ سے فرمایا کہ اپنے بچوں کو بُلا لاؤ۔ وہ سب بچوں (حضرت حسنؓ، حسینؓ، اُمِ کلثومؓ اور زینبؓ) کو حضورؐ کے پاس لے گئیں۔ اپنے شفیق نانا کی بے چینی دیکھ کر سب بچے رونے لگے۔ حضورؐ نے ان سب کو چُوما، ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور دلاسا دیا۔

رحلت سے قبل جب حضورؐ پر بار بار غشی طاری ہونے لگی تو سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ ان سے حضورؐ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوگیا اور زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے ——— واکربَ اباہ (ہائے میرے باپ کی بے چینی) حضورؐ نے فرمایا "تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ کے وصال سے پہلے سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ آپؐ کے قریب بیٹھ کر رونے لگیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جانِ پدر، روؤ نہیں، تمہارے رونے سے عرشِ الٰہی بھی رو رہا ہے۔"

پھر آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے سیدہؓ کے آنسو پونچھے اور انہیں تسلی و تشفی دی۔

جس وقت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک عالمِ قدس میں پہنچی تو سیدہ فاطمۃ الزہراؓ پر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور شدتِ الم میں ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

پیارے ابا جان آپ نے اللہ کے بلاوے کو قبول کر لیا۔

پیارے ابا جان آپ فردوس بریں کو سدھار گئے۔

ہائے ابا جان جبرئیلؑ کو آپ کی رحلت کی خبر کون پہنچائے گا۔

ہائے ابا جان، آپ کے بعد اب وحی کس پر اترے گی اور جبرئیل کس کے پاس آئیں گے۔

پھر انہوں نے دعا مانگی ـــــ "اے اللہ فاطمہ کی روح کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے پاس پہنچا دے۔ الٰہی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مسرور کر دے۔ الٰہی مجھے یہ صدمہ برداشت کرنے کی طاقت دے۔ الٰہی حشر کے دن مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب فرما۔"

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے بعد صحابۂ کرامؓ تعزیت کے لیے سیدہ فاطمہ زہراؓ کے پاس آتے تھے لیکن انہیں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ایک دن حضور پُرنورؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ بن مالک تعزیت و تسلی کے لیے حضرت سیدۃ النساءؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیدہؓ نے ان سے فرمایا "انس یہ تو بتاؤ تمہارے دل نے یہ کیسے گوارا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اقدس زمین کے سپرد کر دو۔"

یہ سن کر حضرت انسؓ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور غم والم کا پیکر

بنے ہوئے واپس گئے۔

تمام اہلِ سیر متفق ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کسی نے سیدہ فاطمۃ الزہرا کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک دن سیدہ فاطمہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر گئیں اور اشکبار ہو کر یہ اشعار پڑھنے لگیں:

مَاذَا عَلَی مَنْ شَمَّ تُرْبَةَ اَحْمَدَ
اَنْ لَّا یَشَمَّ مَدَی الزَّمَانِ غَوَالِیَا
صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا
صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

(جو شخص احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربت کی مٹی ایک بار سونگھ لے اس پر لازم ہے کہ پھر کبھی کوئی خوشبو نہ سونگھے (یعنی اس کو ساری عمر کسی خوشبو کے سونگھنے کی ضرورت نہیں)۔ مجھ پر جو مصیبتیں پڑیں اگر دنوں پر پڑتیں تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔)

کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شعر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہیں۔ سیدۃ النساء حضور کے مرقدِ اقدس پر حاضر ہوئیں تو خود بخود ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔

بعض اہلِ سیر نے خود سیدۃ النساء سے بھی کچھ اشعار منسوب کیے ہیں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہے۔ ان میں چند اشعار یہ ہیں:۔

اغبر آفاق السماء وکورت	شمس النہار واظلم العصران
والارض من بعد النبی کئیبۃ	اسفا علیہ کثیرۃ الاحزان
فلیبکہ شرق البلاد وغربہا	ولتبکہ مضر وکل یمان

يَا خَاتَمَ الرُّسُلِ الْمُبَارَكِ صِنْوُهُ   صَلَّى عَلَيْكَ مُنَزِّلُ الْقُرْآنِ

(آسمان غبار آلود ہو گیا۔ آفتاب لپیٹ دیا گیا۔ دنیا میں تاریکی ہو گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زمین نہ صرف غمگین ہے بلکہ فرطِ الم سے شق ہو گئی ہے۔ چاہیے کہ آپؐ پر مشرق و مغرب کے رہنے والے روئیں اور چاہیے کہ تمام اہلِ یمن اور قبیلہ مضر کے لوگ آپؐ کی وفات پر روئیں۔ اے خاتم الرسل آپؐ برکت سعادت کی جو سے فیض ہیں۔ آپ پر تو قرآن نازل کرنے والے نے بھی درود و سلام بھیجا ہے۔

مرثیہ کے یہ دو شعر بھی سیدۃ النساءؑ کی طرف منسوب ہیں:

إِنَّا فَقَدْنَاكَ فَقْدَ الْأَرْضِ وَابِلَهَا
وَغَابَ مُذْ غِبْتَ عَنَّا الْوَحْيُ وَالْكُتُبُ
فَلَيْتَ قَبْلَكَ كَانَ الْمَوْتُ صَادَفَنَا
لَمَّا نُعِيْتَ وَحَالَتْ دُوْنَكَ الْكُتُبُ

(آپؐ ہم سے کیا جدا ہو گئے کہ زمین اپنی طراوت سے محروم ہو گئی۔ آپؐ کے تشریف لے جانے سے وحی اور خدائی کتابوں کے اترنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ کاش آپؐ کی رحلت سے پیشتر اور اس وقت سے پہلے جب مٹی نے آپؐ کو پوشیدہ کیا ہمیں موت آجاتی اور ہم مر گئے ہوتے)

رضی اللہ عنہا

میراثِ رسول کا معاملہ

شمالی حجاز میں خیبر کے قریب مدینہ منوّرہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے "فدک" نام کا ایک قدیم قصبہ تھا جس پر یہودی قابض تھے۔ وہاں پانی کے چشمے تھے اور اناج اور کھجور کی پیداوار ہوتی تھی۔ اوائل ۷ھ ہجری میں فتح خیبر کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت محیصہؓ بن مسعود انصاری کو ایک دستۂ فوج کے ساتھ اہل فدک کی طرف روانہ کیا کہ ان کو دعوت اسلام دیں۔ اہلِ فدک نے اسلام تو قبول نہ کیا لیکن حضورؐ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ نصف زمین اور اس کی پیداوار مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ فدک کی یہ زمین بطور فے حضورؐ کے قبضے میں آگئی۔ جب تک حضورؐ پُرنورؐ اس دنیائے فانی میں رونق افروز رہے فدک کی زمین اور باغات کی آمدنی کو آپؐ اپنے اہلِ بیت اور مسافروں کے اخراجات کے لیے صرف فرماتے رہے۔ اسی طرح خیبر کی زمین اور باغات کو آپؐ نے تین حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا۔ دو حصوں کی آمدنی عام مسلمانوں کے لیے وقف تھی اور ایک حصے کی آمدنی ازواجِ مطہراتؓ کے سالانہ مصارف کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی اس میں سے بھی جو کچھ بچ جاتا وہ غریب اور نادار مہاجرین کی اعانت پر صرف ہوتا تھا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد ازواجِ مطہراتؓ نے چاہا کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں بھیجیں اور وراثت کا مطالبہ کریں لیکن اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کو یاد دلایا کہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ میرا کوئی وارث نہ ہوگا، میرے تمام متروکات صدقہ ہوں گے۔ یہ سن کر سب خاموش ہوگئیں اور اپنا مطالبہ وہیں ختم کر دیا۔

دوسری طرف سیدہ فاطمۃ الزہرا اور حضرت عباس بن عبد المطلب (عم رسول) نے حضرت ابوبکر صدیق سے مطالبہ کیا کہ خیبر اور فدک کی جائداد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے طور پر) ان میں تقسیم کی جائے۔ اس مطالبہ کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا:۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے، ہمارے مال میں وراثت نہیں ہوگی ہم جو کچھ چھوڑیں گے، صدقہ ہوگا۔ البتہ آلِ محمد اس میں سے نفقہ لے سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! سلوک کرنے کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت مجھ کو اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔"

(بخاری کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر)

دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

"خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا، اس کی جو حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھی وہی رہے گی اور میں وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوہ خیبر)

تیسری روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

"میں بالکل وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور اس میں سے کچھ ترک نہ کروں گا کیونکہ مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے کسی

چیز سے بھی انحراف کیا (کچھ بھی چھوڑا) تو کج ہو جاؤں گا۔"

(بخاری کتاب الجہاد باب فرض الخمس)

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس جائداد کا وہی انتظام کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھا، وہ سال بھر کے لیے اس میں سے اہل بیت کا نفقہ نکال لیتے تھے، اس کے بعد جو باقی بچتا تھا اس کو خدا کا مال قرار دیتے تھے یعنی مسافروں غریبوں مسکینوں اور اہل حاجت پر صرف کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جواب سن کر سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کا ردِ عمل کیا تھا؟ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں:۔

(۱) حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ناراض ہو گئیں اور آخر وقت تک ان سے گفتگو نہیں کی۔

(صحیح بخاری)

(۲) حضرت فاطمہؓ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جواب سے رنج تو ضرور ہوا اور وہ ناراض بھی ہوئیں لیکن بعد میں راضی ہو گئیں۔

(طبقات ابن سعد)

(۳) حضرت فاطمہؓ بیمار ہوئیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کی مزاج پرسی کی اور فرمایا:۔

"میں نے تو گھر بار، مال و دولت اور کنبہ و قبیلہ محض اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا اور اے اہل بیت تمہاری رضا کے لیے چھوڑا تھا۔"

اس پر حضرت فاطمہؓ ان سے خوش ہو گئیں اور کوئی غبار دل میں باقی نہ رکھا۔

(البدایہ والنہایہ ——— حافظ ابن کثیرؒ)

(۴) حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جواب سن کر فرمایا:

"پھر آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے اس کے

مطابق عمل کیجئے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۱)

(۵) حضرت فاطمہؓ نے صدیق اکبرؓ کا جواب سن کر اپنے حق پر دوبارہ زور دیا تو انہوں نے فرمایا:۔

"اے خیرۃ النساء، اے خیر الآباءؐ کی لخت جگر! خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا۔ میں نے وہی کچھ کیا جس کا آپؐ نے حکم دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدک سے آپ کی ضروریات زندگی (خوراک) لیا کرتے تھے اور باقی کو مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور مجاہدین کو سواریاں اسی سے مہیا فرماتے۔ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی وہی کچھ کروں گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر حضرت فاطمہؓ راضی ہو گئیں۔"

(شرح نہج البلاغۃ (جلد خامس) علامہ کمال الدین میثم البحرانی)

جمہور علماء اہل سنت وجماعت نے حضرت فاطمہؓ کی ناراضی والی روایت کو محل نظر ٹھہرایا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس موضوع پر بخاری کی کئی روایتوں میں سے صرف ایک روایت میں حضرت فاطمہؓ کی ناراضی بیان کی گئی ہے اور یہ راوی کی قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ بات باور نہیں کی جاسکتی۔ کہ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ جیسی پاک فطرت ہستی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سن کر اسے تسلیم نہ کیا بلکہ یہ ارشاد سنانے والے سے ناراض ہو گئیں اور یوں بھی سیدہ فاطمہؓ کی ارفع واعلیٰ سیرت وکردار پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ان کو دنیا کے مال اور جائداد سے کوئی رغبت نہ تھی ان کو تو جو مقررہ حصہ ملتا تھا اس کو بھی راہِ خدا میں لٹا دیتی تھیں اور خود فقر و فاقہ سے زندگی بسر

کرتی تھیں اس لیے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی لَا نُوْرَثُ، مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ (ہمارا کوئی وارث نہ ہوگا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔) سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسی عظیم المرتبت اور پاک نہاد ہستی سے ناراض ہوگئی ہوں۔ اگر وہ رنجیدہ ہوئیں بھی اور اس کا کسی شکل میں اظہار بھی کیا تو اس کی تاویل یہی کی جاسکتی ہے کہ وہ حضورؐ کے ارشاد کا مطلب کچھ اور سمجھتی تھیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کا جو مفہوم سمجھتے تھے، اس سے ان کو اتفاق نہ ہوگا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ ناراضی تبقاضائے بشریت تھی اور عارضی تھی، بعد میں وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے راضی ہوگئیں اور کسی قسم کی رنجش اپنے دل میں باقی نہ رکھی۔

سیدۃ النساءؓ کا سفرِ آخرت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کا سب سے زیادہ صدمہ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو ہوا۔ وہ ہر وقت غمگین اور دل گرفتہ رہنے لگیں۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ حضورؐ کے وصال کے بعد کسی نے سیدہؓ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سیدۃ النساءؓ کو بھی خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ پہنچا جس کی وہ اسی دن سے منتظر تھیں، جب حضورؐ نے انہیں بتایا تھا کہ میرے اہلِ بیت میں سے سب سے پہلے تم مجھے عالمِ آخرت میں ملو گی۔

سیدہؓ کی تاریخ وفات کے بارے میں اہلِ سیر میں سخت اختلاف ہے۔ مختلف روایات کے مطابق سیدہؓ نے حضورؐ کے وصال کے ـــ ستر دن ـــ دو ماہ ـــ چار ماہ ـــ چھ ماہ ـــ آٹھ ماہ یا اٹھارہ ماہ بعد وفات پائی۔ جمہور اربابِ سیر نے چھ ماہ والی روایت کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے ـــ کہ سیدۃ النساءؓ نے ۳ رمضان المبارک ۱۱ھ ہجری (منگل کی رات کو) سفرِ آخرت اختیار کیا۔ محققین علمائے شیعہ کے نزدیک سیدہؓ نے ۳ جمادی الآخرہ ۱۱ھ کو وفات پائی ـــ بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ کے وصال کے بعد آپؐ کی محبوب بیٹی چند ماہ سے زیادہ آپؐ سے جدا نہ رہیں اور بہت جلد اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر جنت الفردوس میں پہنچ گئیں۔ سیدہؓ کا کس مرض میں انتقال ہوا یا وہ کتنا عرصہ صاحبِ فراش رہیں، اہلِ سیر نے اس کی تصریح

نہیں کی۔ اس ضمن میں جو روایتیں ملتی ہیں ان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیدہؑ نے اپنی وفات سے پہلے کیا کیا وصیتیں کی تھیں اور یہ کہ انہیں پہلے سے اپنی وفات کا احساس ہو گیا تھا۔ البتہ بعض ارباب سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شدتِ غم سے سیدہؑ کا جسم روز بروز گھلنے لگا یہاں تک کہ وہ سخت نحیف و نزار ہو گئیں اور انتہائی ضعف و نقاہت کے سبب وفات پا گئیں۔

علامہ ابن اثیر نے "اُسُدُ الغابہ" میں لکھا ہے کہ وفات سے پہلے سیدہ فاطمہؑ نے حضرت اسماءؓ بنت عمیس (مشہور صحابیہ) کو بلا کر فرمایا کہ

"میرا جنازہ لے جاتے وقت اور تدفین کے وقت پردہ کا پورا لحاظ رکھنا سوائے اپنے اور میرے شوہر کے اور کسی سے میرے غسل میں مدد نہ لینا اور تدفین کے وقت زیادہ ہجوم نہ ہونے دینا"

حضرت اسماءؓ نے کہا، "یا بنت رسول اللہ میں نے حبش میں[1] دیکھا ہے کہ جنازے پر درخت کی شاخیں باندھ کر ایک ڈولے کی صورت بنا لیتے ہیں اور اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔" پھر انہوں نے کھجور کی چند شاخیں منگوائیں انہیں جوڑا اور پھر ان پر کپڑا تان کر سیدہ بتولؑ کو دکھایا۔ انہوں نے اسے پسند کیا اور بعدِ وفات ان کا جنازہ اسی طریقہ سے اٹھا۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے "استیعاب" میں بھی یہی روایت درج کی ہے لیکن علامہ ابن سعدؒ کاتب الواقدی نے "طبقات" میں اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "اصابہ" میں ایک عجیب روایت بیان کی ہے۔ ابن سعدؒ نے اس کو

---

[1] حضرت اسماءؓ بنت عمیس اپنے پہلے خاوند حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے ہمراہ ۵ نبوت میں حبش کو ہجرت کر گئی تھیں اور وہاں کئی برس مقیم رہی تھیں۔

"اُمِّ سلمیٰ" سے روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے "اُمِّ رافعؓ" سے۔ قیاس یہ ہے کہ اُمِّ سلمیٰ اور اُمِّ رافع ایک ہی شخصیت ہے۔ اصل نام سلمیٰ اور کنیت اُمِّ رافع ہے۔ یہ سیدہ فاطمہ زہراؓ کی کنیز تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جس وقت حضرت فاطمہؓ کی وفات ہوئی حضرت علیؓ گھر سے باہر تھے، حضرت فاطمہؓ نے مجھ سے فرمایا کہ میں غسل کروں گی، پانی کا انتظام کرو اور میرے پہننے کے لیے صاف اور عمدہ کپڑے بھی نکال دو۔ میں نے پانی کا انتظام کر دیا اور کپڑے بھی نکال دیئے۔ حضرت فاطمہؓ نے اچھی طرح غسل کیا اور کپڑے پہنے پھر فرمایا میرا بستر کر دو میں لیٹوں گی۔ میں نے بستر بچھا دیا۔ وہ بستر پر قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹ گئیں اور مجھ سے فرمایا، اب میرا چل چلاؤ ہے، میں غسل کر چکی ہوں اب دوبارہ غسل کی ضرورت نہیں اور نہ اب میرا بدن کھولا جائے۔ یہ فرما کر انہوں نے وفات پائی۔ جب حضرت علیؓ گھر آئے تو میں نے یہ واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے اسی غسل پر اکتفا کیا اور ان کو دفن کر دیا۔

ابن جوزی اور بعض دوسرے علماء نے اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ کو حضرت اسماءؓ بنت عمیس (زوجۂ حضرت ابوبکر صدیقؓ) حضرت سلمیٰ اُمِّ رافعؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تدفین سے پہلے شریعت کے مطابق غسل دیا۔

جمہور علمائے شیعہ کے نزدیک سیدہ فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق ان کی میت کو صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غسل دیا، خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی اور ایک خاص تابوت میں ان کا جنازہ اٹھایا جو حضرت اُمِّ ایمنؓ نے سیدہ فاطمہؓ کی وفات سے پہلے بنا کر ان کو دکھا دیا تھا۔ پھر انہیں رات

ہی کو دفن کر دیا گیا۔

سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کی نمازِ جنازہ کس نے پڑھائی؟ امام بخاریؒ اور کچھ دوسرے محدثین اور اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ سیدہؓ کی نمازِ جنازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پڑھائی۔ ایک روایت میں حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور ایک میں خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیق کا نام بھی لیا گیا ہے۔

(البدایہ والنہایہ - ابنِ کثیرؒ)

"کنزالعمال" میں حضرت (امام) جعفر صادقؒ اپنے والد حضرت (امام) محمد باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

"حضرت فاطمہ دختر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئیں تو ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لائے۔ ابوبکرؓ نے علی المرتضیٰ کو جنازہ پڑھانے کے لیے کہا کہ آگے تشریف لائیے تو علی المرتضیٰ نے جواب دیا کہ آپ خلیفہ رسول ہیں میں آپ سے پیش قدمی نہیں کر سکتا۔ پس ابوبکرؓ نے مقدم ہو کر نمازِ جنازہ پڑھائی۔ (کنزالعمال جلد ۶ صہ ۳۱۸ طبع قدیم)

علامہ محب طبریؒ نے "ریاض النضرۃ" میں حضرت علی (زین العابدینؒ) بن حسینؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے:۔

"حضرت علیؓ نے نمازِ جنازہ کے لیے ابوبکرؓ سے کہا کہ آگے تشریف لائیے۔ ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ اے ابوالحسن! آپ کی موجودگی میں؟ انہوں نے کہا، ہاں، آپ آگے تشریف لائیے۔ خدا کی قسم آپ کے بغیر کوئی دوسرا شخص فاطمہؓ کا جنازہ نہیں پڑھائے گا۔ پس ابوبکرؓ نے فاطمہؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور وہ رات کو

دفن کر دی گئیں۔" (ریاض النضرۃ جلد ا ص۱۵۶)

علامہ ابن سعدؒ نے "طبقات" میں مکمل سند کے ساتھ یہ روایت درج کی ہے :-

"ابراہیم نخعیؒ نے کہا کہ ابوبکر الصدیقؓ نے فاطمہؓ دختر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نمازِ جنازہ پڑھی اور چار تکبیریں کہیں۔"

(طبقات ابنِ سعد جلد ۸ صفحہ ۱۹ طبع لیڈن یورپ)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی تدفین سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کی وفات کی اطلاع ہی نہ دی لیکن یہ بات اس لیے قابلِ یقین نہیں کہ خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماءؓ بنتِ عمیس حضرت فاطمہؓ کی وفات سے پہلے ان کے پاس موجود تھیں اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کی وفات سے بے خبر کیسے رہ سکتے تھے۔

اس مسئلہ میں ہم "واللہ اعلم بالصواب" کہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ سیّدہ فاطمہؓ کی نمازِ جنازہ کسی نے بھی پڑھائی ہو اس سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ آخرت میں اس کے بارہ میں کسی سے سوال ہو گا۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ کی تدفین رات کے وقت عمل میں آئی۔ جنازہ بڑی خاموشی سے اٹھایا گیا اور اس میں بنو ہاشم کے علاوہ چند خاص صحابۂ کرامؓ ہی شریک ہو سکے۔ ایک روایت میں ہے کہ سیّدہؓ کو حضرت علیؓ، حضرت عباس بن عبدالمطّلب اور حضرت فضل بن عباسؓ نے قبر میں اتارا۔ جائے تدفین کے بارے میں بھی روایتوں میں اختلاف ہے۔ اس سلسلہ کی مشہور روایتیں یہ ہیں :-

ا۔ سیّدہ فاطمہؓ کا مدفن دارِ عقیل کے ایک گوشے میں ہے۔

۲- جنت البقیع میں ہے۔
۳- رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے روضۂ مبارک کے قریب ہے۔
۴- سیدہ فاطمہؑ اپنے گھر میں مدفون ہوئیں جب مسجدِ نبوی میں توسیع کی گئی تو یہ جگہ شاملِ مسجد ہو گئی۔

مدینہ منورہ میں سیدہ فاطمۃ الزہراؑ سے منسوب مزار پر صدیوں تک ایک شاندار عمارت قائم رہی جب سعودی حکومت نے ایسی عمارتیں اور قبے منہدم کرائے تو اس عمارت کو بھی منہدم کرا دیا۔

ان روایتوں کے اختلاف اور ہر ایک کے حق میں مختلف دلائل دیکھ کر ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سیدۃ النساءؑ کی آخری آرام گاہ کہاں ہے۔ اس لیے ہم یہاں بھی واللہ اعلم بالصواب کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ فی الحقیقت سیدۃ النساءؑ کی حقیقی یادگار ان کا اسوہ یا سیرت و کردار ہے جس پر عمل کر کے ہماری خواتین دنیا اور عقبیٰ میں فلاح پا سکتی ہیں۔

مؤرخ مسعودی نے بیان کیا ہے کہ سیدہ فاطمہؑ کی تدفین کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ گھر واپس گئے تو سخت غمزدہ تھے اور بار بار یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

ارى علل الدنيا على كثيرة — وصاحبها حتى الممات عليل
لكل اجتماع من خليلين فرقة — وكل الذي دون الفراق قليل
وان افتقادي فاطما بعد احمد — دليل على ان لا يدوم خليل

(میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کی بیماریوں اور مصیبتوں نے مجھے چاروں طرف سے آ گھیرا ہے اور اہلِ دنیا جب تک دنیا میں ہیں بیمار ہیں، ہر یک جائی کے بعد دوستوں سے مفارقت ہو کر رہتی ہے اور وہ زمانہ جو مفارقت کے سوا ہوتا ہے تھوڑا ہوتا ہے۔ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فاطمہؑ کی مفارقت اس

بات کی دلیل ہے کہ دوست ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا۔)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کچھ عرصہ تک روزانہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی قبر پر تشریف لے جاتے، حضرت فاطمہؓ کو یاد کر کے روتے اور یہ شعر پڑھتے:

مالی مررت علی القبور مسلما	قبر الحبیب فلم یرد جوابی
یا قبر مالک لا تجیب منادیا	امللت بعدی خلة الاحباب

(خدایا میری کیا حالت ہے کہ میں قبروں پر سلام کرنے آتا ہوں لیکن حبیب کی قبر میرے سوال کا جواب ہی نہیں دیتی۔ اے قبر تجھے کیا ہوا کہ پکارنے والے کو کوئی جواب نہیں دیتی کیا تو احباب کی محبت سے رنجیدہ ہوگئی ہے)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی وفات کا علم اہل مدینہ کو ہوا تو تمام مرد اور عورتیں اشکبار ہوگئے۔ لوگوں پر اس طرح حیرت اور دہشت طاری ہوئی جس طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دن طاری ہوئی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ بادیدۂ گریاں حضرت علی المرتضیٰؓ کے پاس گئے اور ان سے تعزیت کی۔

مناقب

ابنِ ابی حاتمؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضرت علیؓ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

تسألنی عن رجل کان من احب الناس الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وکانت تحتہ ابنتہ واحب الناس الیہ

(تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضورؐ کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی)

اس کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا اور ان پر ایک چادر[1] ڈال کر دعا مانگی:-

اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیرا

(الٰہی یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی کو دور کر دے اور انہیں پاک کر دے)

---

[1] ایک روایت میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کالے رنگ کی ایک کملی تھی جس پر کچھ نقوش بنے ہوئے تھے حضور نے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کو بالترتیب اس کملی میں لے لیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ میں بھی تو آپؐ کے اہلِ بیت میں سے ہوں (یعنی مجھے بھی اس چادر میں داخل کرکے میرے حق میں دعا فرمایئے)

حضورؐ نے فرمایا:-

" تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔"

اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلمؒ، ترمذیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابن جریر طبریؒ، حاکمؒ، بیہقیؒ وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت واثلہؓ بن اسقع اور بعض دوسرے صحابہ کرامؓ سے روایت کی ہیں۔ اسی بنا پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ سورۂ احزاب کی اس آیت (آیۂ تطہیر) کا اطلاق ازواج مطہراتؓ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر بھی ہوتا ہے۔

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا۔

(اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبی سے گندگی کو دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے)

جس سیاق و سباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اہل البیت سے مراد ازواجِ مطہرات ہیں لیکن متعدد احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بھی اپنا اہل البیت قرار دیا۔

مولانا ابو القاسم رفیق دلاوری مرحوم نے اپنی کتاب "سیرتِ کبریٰ" میں

اہلِ بیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"اہلِ بیت تین ہیں : —— اہلِ بیت نسب، اہلِ بیت سُکنیٰ اور اہلِ بیت ولادت —— گو قرآنِ پاک میں اُمّہات المؤمنین کے سوا کسی کے حق میں "اہلِ بیت" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور لغتِ عرب میں بھی یہ لفظ بیویوں ہی کے لیے مستعمل ہے تاہم احادیثِ نبویہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرّف بہ ایمان ہونے والے تمام ہاشمی اور آپؐ کی اولادِ اطہار بھی تبعاً اہلِ بیت میں شامل ہیں۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اہلِ بیت نسب میں ہاشم کی وہ تمام اولاد داخل ہے جس کو سعادتِ ایمانی حاصل ہوئی مثلاً حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عقیلؓ بن ابی طالب، حضرت اُمّ ہانیؓ بنت ابی طالب، جعفرؓ بن ابی طالب، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور ان سب کی اولاد۔ حضرت نوفلؓ بن حارث، حضرت ربیعہؓ بن حارث، حضرت مغیرہ (ابو سفیان) بن حارث، عبدالمطّلب بن ربیعہ بن حارث، حضورؐ کی مؤمنہ پھوپھیاں حضرت صفیہؓ، حضرت اروٰیؓ اور حضرت عاتکہؓ، عتبہؓ بن ابی لہب، معتبؓ بن ابی لہب، دُرّہؓ بنتِ ابی لہب یہ سب اہلِ بیت نسب تھے۔

اہلِ بیت سُکنیٰ میں حضورؐ کی تمام ازواج مطہّراتؓ داخل ہیں۔ اہلِ بیت ولادت میں حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تمام اولاد اطہار داخل ہے یعنی تین صاحبزادے قاسمؓ، عبداللہؓ اور ابراہیمؓ یہ سب صغرسنی میں فوت ہو گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت اُمّ کلثومؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آیۂ تطہیر کے نزول کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چھ مہینے تک یہ معمول رہا کہ صبح نمازِ فجر کے لیے نکلتے وقت سیدہ فاطمہؓ کے دروازے پر جا کر پکارتے :

"اے اہلِ بیت نماز پڑھو"

اور پھر یہ آیت (آیۂ تطہیر) تلاوت فرماتے۔ (جامع ترمذی)

حضرت علیؓ نے عورا بنت ابی جہل سے نکاح کا ارادہ کیا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں اکٹھی ہوں۔ اس موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا :

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي فَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِي۔

(فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو ناراض کرے گا وہ مجھ کو ناراض کرے گا۔) (صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۵۳۲)

بخاری ہی کی ایک اور حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا گیا ہے :۔

"فاطمہؓ میرے جسم کا ایک حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھ کو اذیت دی۔" (بخاری جلد ۲ ص ۸۷۰)

سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کے مناقب میں کچھ اور احادیث حسبِ ذیل ہیں :۔

۵ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

سَيِّدَةُ نِسَاءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ

(فاطمہ اہلِ جنت کی خواتین کی سردار ہیں۔)

(البدایہ والنہایہ۔ حافظ ابن کثیرؒ)

۵ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جنت کی عورتوں کی سردار مریمؑ پھر فاطمہؑ بنت محمدؐ، پھر خدیجہؓ پھر آسیہؑ (فرعون کی بیوی) ہیں۔"

("الاستیعاب" حافظ ابنِ عبدالبرؒ)

۵ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تمہاری تقلید کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں مریمؑ، خدیجہؓ، فاطمہؑ اور آسیہؑ (زوجۂ فرعون) کافی ہیں۔"

(ترمذی کتاب المناقب)

۶ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر چار خط کھینچے۔ پھر لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ یہ کیا ہے۔ سب نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "فاطمہؑ بنتِ محمدؐ، خدیجہؓ بنتِ خویلد، مریمؑ بنتِ عمران، آسیہؑ بنتِ مزاحم (زوجۂ فرعون) ان لوگوں کو جنت کی عورتوں پر سب سے زیادہ فضیلت ہے۔"

("الاستیعاب" حافظ ابنِ عبدالبرؒ)

۷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"فاطمہ سیدۃ نساء العالمین (تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار) ہیں"

("الاصابہ" حافظ ابنِ حجرؒ)

۸ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"فاطمہ خواتینِ اُمت (یا خواتینِ مومنین) کی سردار ہیں۔"

(صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام ص ۵۱۲)

۹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"فاطمہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گی" (کنز العمال)

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت فاطمہؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یَغْضِبُ بِغَضَبِكِ وَیَرْضٰی لِرِضَاكِ۔

(جس سے تو ناراض ہو گی اللہ بھی اس سے ناراض ہو گا اور جس سے تو راضی ہو گی اللہ بھی اس سے راضی ہو گا۔)

(مستدرک الصحیحین)

حضرت فاطمہؑ کے مناقب و فضائل میں ایسی اور بھی کئی حدیثیں صحاح ستہ اور دوسری کتابوں میں ملتی ہیں۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جمہور اہل سنت وجماعت کے نزدیک خلفائے راشدینؓ کے بعد ازواجِ مطہراتؓ تمام صحابہؓ اور صحابیاتؓ سے افضل ہیں اور ازواجِ مطہراتؓ میں بھی اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ امتیازی درجہ رکھتی ہیں لیکن سیدہ فاطمۃ الزہراءؑ کے فضائل و مناقب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کے پیشِ نظر ان عظیم المرتبت خواتین کے مرتبہ کے تعیّن میں علماء میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (دانش گاہ پنجاب) اور سیرۃِ عائشہؓ (مؤلفہ سید سلیمان ندویؒ) میں جو بحث کی گئی ہے ہم اس کو یہاں بجنسہٖ نقل کر دیں۔ قارئین اس سے جو بھی نتیجہ اخذ کریں وہ ان کی صوابدید پر منحصر ہے۔ "اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں ہے:

"حضرت فاطمہؑ کی فضیلت کا مسئلہ ہماری اپنی تصانیف میں بڑی اہمیت کا مالک رہا ہے مگر بعض موقعوں پر قدرے غلوِ عقیدت کا شائبہ بھی آ گیا ہے۔ بہر حال ان کے افضل النساء ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے اس تفضیلی رجحان میں سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ

اور ان کی دوسری بہنوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور آٹھ جہات سے انہیں کو باقی بہنوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔
(دیکھئے ابنِ حجر الہیتمی: "الفتاوی الحدیثیۃ۔ مصر ۱۳۵۰ھ ص ۲۲)
عقیدت کے یہ جملہ مظاہر طبعی ہیں کیونکہ ان کی ذات رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز تھی۔ بعض لوگ اس پر مُصر ہیں کہ اہل بیت، آل الکساء اور آل العباء کی تعبیروں سے بالخصوص مباہلے کے لیے نکلنے والے افراد یعنی آنحضرت ص، حضرت علی ؑ، حضرت فاطمہ ؑ، حضرت حسن ؑ اور حضرت حسین ؑ مراد ہیں۔
(البیضاوی، تفسیر ۱: ۵۰ تا ۵۱ و ۴: ۴۰۷، اور الخازن: تفسیر ۱: ۵۱۱ و ۵: ۴۰۶ ببعد وغیرہ)
حضرت فاطمہ ؑ کے جنّت کی عورتوں کی سیّدہ (یعنی سردار) ہونے سے متعلق جو احادیث ہیں (دیکھئے ابنِ عبد البرّ: "الاستیعاب ۴: ۲۷۶ ببعد، ابو نعیم: حلیۃ، مصر ۱۳۵۱ھ، ۲: ۴۳) وہ بھی ان محترمہ خواتین کے مقابلے میں جن کے نام ان میں مذکور ہیں، حضرت فاطمہ ؑ کی قدر و منزلت کی تعیین کے مسئلے کو پیش منظر میں لے آتی ہیں۔ اس بارے میں جو فیصلے کیے گئے ہیں وہ متنازع فیہ ہیں۔
ایسی حدیثوں میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ حضرت فاطمہ ؑ آنحضرت ص کا ایک جزو ہیں۔ (البخاری، ۴: ۲۱، نیز العزیزی: شرح الجامع الصغیر، ۱: ۲۷۱)
بعض لوگ عورتوں میں حضرت مریم ؑ کا درجہ سب سے اونچا مانتے ہیں اور ان کے بعد حضرت فاطمہ ؑ کو اور ان کے بعد ان کی والدہ حضرت

خدیجہؓ کو شمار کرتے ہیں (الحفنی: حاشیہ علی الجامع الصغیر، بولاق ۱۲۹۰ھ، ۱: ۱۵۶)

افضلیت کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ میں کون زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہیں اور یہ مسئلہ علم کلام میں ایک بحث کا موضوع بن گیا ہے۔ اس بارے میں جو فیصلے کیے گئے ہیں وہ عموماً اس نوعیت کے ہیں جن سے ان دونوں کو ایک مساوی درجہ دینے کا میلان پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف حضرت عائشہؓ کو حضرت فاطمہؓ سے اس لیے زیادہ بلند مرتبہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت فاطمہؓ کی نسبت بہت زیادہ احادیث مروی ہیں۔ (سراج الدین الفرغانی: الامالی ترکی ترجمہ از حافظ رفیع، استانبول ۱۳۰۲ھ، ص ۲۴)

تو دوسری طرف حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ سے اس نقطۂ نظر سے افضل ہیں کہ انہیں آنحضرت کا جزو کہا گیا ہے۔ (دیکھیے نیز ملا علی القاری: شرح فقہ الاکبر، مصر ۱۳۲۳ھ، ص ۱۰۷ ببعد)

ظاہریوں میں سے ابن حزم الاندلسی حضرت عائشہؓ کے دیگر سب اصحاب رسولؐ (بشمول حضرت فاطمہؓ) سے افضل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے۔ (الفصل فی الملل والاھواء والنحل، مصر ۱۳۲۱ھ، ۴: ۱۱۹)

مگر الآلوسی اس کے برعکس حضرت فاطمہؓ کو حضرت عائشہؓ سے ہر جہت سے برتر سمجھتا ہے۔ (روح المعانی، ۱: ۵۷۸)

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۹۳-۹۴)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے "سیرۃ عائشہؓ" میں اس مسئلہ پر یوں

خامہ فرسائی کی ہے :

"تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ اسلام میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ، حضرت فاطمہ زہراءؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ عورتوں میں سب سے افضل ہیں۔ جمہور علماء نے سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ پھر حضرت خدیجہؓ اور تیسرے درجہ میں حضرت عائشہؓ کا نام رکھا ہے لیکن یہ ترتیب کسی نصِ شرعی یا حدیثِ صحیح سے ثابت نہیں بلکہ علماء نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد اور ذوق سے یہ ترتیب قائم کی ہے۔ ان تینوں خواتین کے الگ الگ فضائل اور مناقب احادیث میں مروی ہیں۔ اسی لیے بعض علماء نے اس باب میں توقف مناسب سمجھا ہے۔ علامہ ابنِ حزم نے تمام علماء کے برخلاف علانیہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نہ صرف اہلِ بیت میں نہ صرف عورتوں میں بلکہ صحابہؓ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں۔ اس دعویٰ پر ان کے بہت سے دلائل ہیں جس کو شوق ہو وہ "ملل و نحل" میں فضلِ صحابہؓ کی بحث کی طرف رجوع کرے۔ ہمارا اعتقاد اس بارے میں علامہ ابنِ تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابنِ قیمؒ کے ساتھ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فضیلت سے مقصود اگر درجۂ اخروی ہے تو اس کا حال خدا ہی کو معلوم ہے لیکن دنیاوی حیثیت سے حقیقت یہ ہے کہ ان کے فضائل مختلف الجہات ہیں۔ اگر نسبی شرافت کا اعتبار ہے تو حضرت فاطمہ زہراءؓ سب سے افضل ہیں اگر ایمان کی سابقیت اسلام کی ابتدائی مشکلات کے مقابلہ اور اس زمانہ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعانت و

تسکینِ خاطر کی حیثیت سے دیکھئے تو حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کی بزرگی سب پر مقدم ہے لیکن اگر علمی کمالات، دینی خدمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات وارشادات کے نشر واشاعت کی فضیلت کا پہلو سامنے ہو تو ان میں صدیقہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔"

(زرقانی بر مواہب جلد ۳ صفحہ ۲۶۹)

(حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا حال)
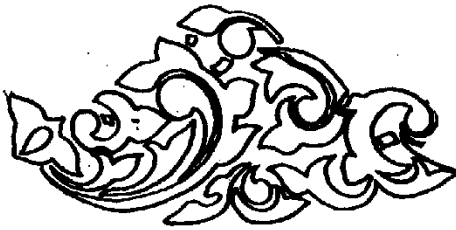
زوجِ بتولؓ

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے تو چند ماہ بعد آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کے درمیان رشتۂ مواخاۃ کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اس سے پہلے مہاجرین مسلمانانِ مدینہ کے مہمان تھے لیکن اب وہ ان سے رشتۂ اخوّت و یگانگت میں منسلک ہو گئے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ایسی بے پناہ محبت اور خیر خواہی پیدا ہو گئی کہ حقیقی بھائیوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس موقع پر حضورؐ نے اپنے ایک نوجوان جان نثار کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور ان کا رشتۂ مواخاۃ کسی سے قائم نہ فرمایا۔ یہ مہاجر نوجوان جن کی پیشانی نورِ سعادت سے درخشاں تھی، کچھ آزردہ سے ہو گئے اور آگے بڑھ کر بارگاہِ رسالتؐ میں یوں عرض پیرا ہوئے:

"یا رسول اللہ آپؐ نے تمام اصحاب کے درمیان مواخاۃ قائم کرائی ہے لیکن میری مواخاۃ کسی سے نہیں کرائی۔"

سیدالانام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوجوان کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں پکڑ لیا اور بڑی محبت سے ان کا نام لے کر فرمایا:

"تم میرے بھائی ہو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔"

حضورؐ کا ارشادِ گرامی سن کر وہ نوجوان فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور

بے اختیار ان کی زبان پر تہلیل و تحمید جاری ہو گئی۔

اس واقعہ کے آٹھ سال بعد چشم فلک نے اسی سرزمین مدینہ پر ایک اور منظر دیکھا۔ ۹ ہجری میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہونے لگے تو آپ کو ضرورت محسوس ہوئی کہ مدینہ منورہ میں اپنا ایک ایسا قابل اعتماد اور قوی جانشین چھوڑ جائیں جو مجاہدین کے اہل و عیال کی حفاظت بھی کر سکے اور منافقین کی شرارتوں کی روک تھام بھی کر سکے۔ اس مقصد کے لیے آپ کی نظر انتخاب اسی نوجوان سعادت مند پر پڑی جس کو آپ نے عقد مواخاۃ کے موقع پر دنیا اور آخرت میں اپنا بھائی بنایا تھا۔ حضورؐ نے ان کو اس ذمہ داری سے آگاہ فرمایا تو وہ دل و جان سے ارشاد نبوی کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے لیکن منافقین کی زبانوں کو کون لگام دے سکتا تھا۔ انہوں نے حضورؐ کے اس جان نثار کو پر صعوبت سفر اور جہاد فی سبیل اللہ سے گریز کا طعنہ دیا تو وہ مسلح ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"یا رسول اللہ میں نے ابتدا سے لے کر آج تک کسی موقع پر بھی راہ حق میں جان لڑانے سے گریز نہیں کیا لیکن اس دفعہ مجھے جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہونے سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟"

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شوق جہاد سے بے تاب اپنے اس مخلص شیدائی پر محبت اور شفقت بھری نظر ڈالی اور فرمایا:

"کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہیں میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔"

(صحیح بخاری)

یہ خوش بخت جوان جن کو سید المرسلین فخر موجودات صاحب قاب قوسین ساقی کوثر

صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور دین میں اپنا بھائی قرار دیا اور جن کی اپنے ساتھ نسبت کو اس نسبت سے تشبیہ دی جو حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تھی، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بن ابی طالب تھے۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ آسمانِ فضائل کا مہرِ عالمتاب ہیں۔ ان کے اوصاف و محاسن اور فضائل و مناقب میں سے ایک ایک تاجِ افتخار کا گوہرِ شاہوار کہے جانے کا مستحق ہے۔ اگرچہ "برادرِ خیر البشرؐ" کی جلالتِ قدر پر مسلمانوں کے سبھی مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ملتِ اسلامیہ کی اس متاعِ گرانمایہ پر کسی بھی زبان میں آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں افراط و تفریط اور غلو و عصبیت سے دامن بچا کر ان کی جامع فضل و کمال شخصیت کو متوازن اور صحیح طریقے سے پیش کیا گیا ہو۔ بعض نے اگر عقیدت اور محبت کے جوش میں حضرتِ والاؓ کو ایک مافوق الفطرت ہستی بنا دیا ہے تو دوسروں نے اس کے ردِ عمل میں اُن کے مقام و مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ ایک فریق کا رویہ درست ہے اور نہ دوسرے کا۔ معلوم نہیں اسلام کے اس بطلِ جلیل کی ایک جامع اور متوازن سیرت نگاری کی سعادت کب اور کس شخص کو نصیب ہو۔ ایک مختصر مضمون میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی درخشندہ سیرت و کردار کی چند جھلکیاں پیش کر دی جائیں۔

اسم گرامی علی ہے۔ مشہور القاب حیدر، مرتضیٰ اور اسد اللہ ہیں۔ کنیت ابوالحسن اور ابوتراب تھی۔ مؤخر الذکر کنیت کو وہ بہت عزیز جانتے تھے کیونکہ یہ عطیہ رسولؐ تھی۔

حسب و نسب کے لیے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا حضرت ابوطالب بن عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام فاطمہؓ بنتِ اسد بن ہاشم تھا جو حضرت ابوطالب کی بنتِ عم تھیں۔ اس طرح حضرت علیؓ باپ

اور ماں دونوں کی طرف سے ہاشمی تھے۔

حضرت ابوطالب نے قریش کے مقابلے میں حضورؐ کی جس طرح سرپرستی، مدافعت اور حمایت کی وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہؓ بنت اسد نے بھی نہایت خلوص اور دلسوزی کے ساتھ حضورؐ کی سرپرستی اور حمایت کی۔ جب انہوں نے وفات پائی تو حضورؐ نے انہیں اپنی قمیص مبارک کا کفن پہنایا اور ان کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا:

"اے میری ماں اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ میری ماں کے بعد ماں تھیں۔ آپ خود بھوکی رہتی تھیں مگر مجھے کھلاتی تھیں۔ آپ کو خود لباس کی ضرورت ہوتی تھی لیکن آپ مجھے پہناتی تھیں۔"[۱۱]

گویا حضرت علیؓ کے والد ماجد اور والدۂ ماجدہ دونوں سرورِ کونین ﷺ کے مربی اور محسن تھے۔ حضرت علیؓ صرف "ابنِ عمِ مصطفےٰ" ہی نہیں تھے بلکہ آپؐ کے مواخاتی بھائی بھی تھے اور آپؐ کی لختِ جگر سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے شوہر (زوجِ بتولؓ) بھی۔

سیدنا علیؓ کی ولادت ۱۳۔ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل کو (بعثتِ نبوی سے دس سال اور ہجرتِ نبوی سے ۲۳ سال قبل) جمعۃ المبارک کے دن مکہ معظمہ میں ہوئی۔ حضرت ابوطالب کی کثیر العیالی اور تنگدستی دیکھ کر حضورؐ نے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی یہ تجویز سوچی کہ جب حضرت علیؓ ذرا سیانے ہوئے تو ان کو اپنی کفالت میں لے لیا گویا ۴ ۔ ۵ برس کی عمر سے حضور کے دامنِ اقدس سے وابستہ ہو گئے اور آغوشِ نبوت میں پرورش اور تربیت پائی۔

بعثتِ نبوی کے بعد جن چار نفوسِ قدسی کو سب سے پہلے قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے ایک حضرت علیؓ تھے۔ اس سلسلہ کی مختلف احادیث کو جمہور علماء نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، مردوں میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ، آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زیدؓ بن حارثہ اور بچوں میں حضرت علیؑ سب سے پہلے سعادت اندوزِ ایمان ہوئے۔ طبری اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت علیؑ نے حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھنی شروع کر دی۔ ایک دن حضرت ابوطالب نے انہیں نماز پڑھتے دیکھا تو پوچھا، "بیٹا یہ کیا دین ہے جس پر تو چل رہا ہے؟" انہوں نے کہا "ابا جان میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا ہوں ان کی تصدیق کی ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔" ابوطالب نے کہا:

"محمدؐ تمہیں بھلائی کے سوا کبھی کسی چیز کی طرف نہیں بلائیں گے، تم ان کے ساتھ لگے رہو۔"

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ نے فرمایا:—

"الٰہی میں نہیں جانتا کہ تیرے نبیؐ کے سوا اس اُمت میں مجھ سے پہلے کسی نے تیری عبادت کی ہو۔"

اس فقرے کو تین بار کہا، پھر سات بار یہ کہا:

"میں نے سب لوگوں سے پہلے (حضورؐ کے ساتھ) نماز پڑھی۔"

تفسیر ابن کثیر، مسندِ احمد، مسندِ بزار، تاریخ ابوالفدا اور بعض دوسری کتابوں میں روایت ہے کہ ۴ نبوت کے آغاز میں جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو خدا کا خوف دلایئے) نازل ہوئی تو حضورؐ نے چند دن بعد بنو ہاشم کو کھانے پر بلایا۔ انتالیس یا چالیس آدمی مدعو تھے۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو حضورؐ نے کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ میں آپ کو ایک ایسی بات کی طرف دعوت دیتا ہوں جو دنیوی اور اُخروی فلاح کی کفیل ہے اور میں نہیں جانتا کہ عرب بھر میں کوئی شخص اپنی قوم کے لیے ایسا بیش بہا تحفہ لایا ہو۔

آپ میں سے کون میری دعوت کو قبول کرتا ہے اور میرا بھائی اور ساتھی بنتا ہے؟

حضورؐ کی تقریر سن کر سب لوگ خاموش رہے لیکن حضرت علیؑ نے اٹھ کر عرض کیا: "اگرچہ میری عمر کم ہے تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" ان کی بات سن کر دوسرے لوگ ہنسنے لگے۔ اس وقت حضرت علیؑ کی عمر تیرہ برس کی تھی۔

ابن ابی حاتمؒ نے یہ واقعہ کسی قدر مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

"تم میں سے کون میرے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اور میرے پیچھے میرے اہل میں میری نیابت کے لیے تیار ہوتا ہے؟"

سب خاموش رہے، حضرت علیؑ کہتے ہیں۔ میں اپنے چچا عباسؓ کی بزرگی کی وجہ سے کچھ نہ بولا۔ جب دوسری مرتبہ حضورؐ نے اپنا ارشاد دہرایا اور میں نے پھر بھی عباسؓ کو خاموش دیکھا تو میں نے عرض کیا، "یارسولؐ اللہ میں ذمہ داری لیتا ہوں، اگرچہ ان دنوں میرا حال بودا تھا، آنکھیں آئی ہوئی تھیں، پیٹ بڑھا ہوا تھا اور ٹانگیں پتلی تھیں۔"

ابن جریر طبریؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے اپنے اہلِ خاندان کو توحید کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اور تو سب چپ رہے البتہ حضرت علیؑ نے اٹھ کر عرض کیا، گو میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں، میری ٹانگیں پتلی ہیں اور مجھے آشوبِ چشم کا عارضہ بھی ہے تاہم میں آپ کا ساتھی اور مددگار بنوں گا۔ حضورؐ نے انہیں بٹھا دیا اور دوسری مرتبہ لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اب کی بار بھی صرف حضرت علیؑ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔

واقعہ کی صورت کچھ بھی ہو، حضرت علیؑ نے حضورؐ سے جو پیمانِ وفا باندھا اسے اپنے عمل سے سچ کر دکھایا اور تنگی، آسانی، دکھ سکھ، ہر حال میں فداکاری کا ایمان افروز نمونہ پیش کیا۔ ہجرتِ نبویؐ تک ان کا یہ حال تھا کہ ہر وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر

تھے۔ حضورؐ تبلیغِ حق کے لیے عام مجموں میں تشریف لے جاتے تھے تو حضرت علیؑ کو کبھی گھر چھوڑ جاتے تھے اور کبھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ۷؁ بعد بعثت میں مشرکین نے بنو ہاشم اور بنو مُطّلب کو شعبِ ابی طالب میں محصور کیا تو حضرت علیؑ بھی حضورؐ کی حمایت میں اپنے والدین اور دوسرے اقربا کے ساتھ تین برس تک ہولناک مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ ۱۰؁ بعد بعثت میں یہ محاصرہ ختم ہوا تو چند ماہ بعد شفیق باپ کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا تاہم حضورؐ کی مشفقانہ سرپرستی نے انہیں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ حضرت ابوطالب اور پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد سرورِ عالمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے حالات سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۳؁ بعد بعثت میں آپؐ کو ہجرت الی المدینہ کا اذن ہو گیا۔

ہجرتِ نبوی کے موقع پر حضرت علیؑ کو یہ لازوال شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے (اپنی ہجرت کے بعد) انہیں اہلِ مکّہ کی امانتیں واپس کرنے کی ذمہ داری سپرد فرمائی اور کاشانۂ اقدس سے نکلتے وقت اپنے بستر پر اپنی سبز حضرموتی چادر اوڑھا کر لٹا دیا۔ اگرچہ سیّدنا علیؑ کے لیے یہ کام جان پر کھیلنے کے مترادف تھا لیکن وہ کسی تامّل کے بغیر بخوشی حضورؐ کے بستر پر لیٹ گئے اور حضورؐ اطمینان سے مشرکین کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے ان کے درمیان سے نکل گئے۔ صبح ہوئی اور کاشانۂ اقدس کے گرد گھیرا ڈالنے والے کفار نے حضرت علیؑ کو حضورؐ کے بستر مبارک سے اٹھتے دیکھا تو سٹپٹا کر رہ گئے۔ ابن جریر طبریؒ اور ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت علیؑ کو گھیر لیا اور ان سے پوچھا "محمدؐ کہاں ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "میں کیا بتا سکتا ہوں، تم لوگوں نے انہیں نکلنے پر مجبور کیا اور وہ نکل گئے۔" مشرکین نے انہیں بہت ڈرایا دھمکایا، یہاں تک کہ ان پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کیا۔ اس کے بعد مسجدِ حرام

انہیں کچھ دیر محبوس رکھا۔ لیکن جب دیکھا کہ ان سے کچھ معلوم کرنا ممکن نہیں تو انہیں چھوڑ دیا۔

سرورِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت کے بعد چند دن قباء میں قیام فرمایا۔ ابھی آپؐ قباء ہی میں تھے کہ حضرت علیؓ بھی ہجرت کرکے آپؐ کی خدمتِ اقدس میں قباء پہنچ گئے۔ حضورؐ کے میزبان حضرت کلثومؓ بن الہدم انصاری نے انہیں بھی اپنا مہمان بنایا۔ طبری نے اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ جب حضرت علیؓ قباء پہنچے تو پاپیادہ سفر کرنے کی وجہ سے ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ قباء سے خاص مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ بھی آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کا آغاز ہوا تو حضورؐ اور دوسرے صحابہؓ کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ نے بھی اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ زرقانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ اینٹیں اور گارا ڈھو ڈھو کر لاتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ رجز پڑھتے تھے:

لا یستوی من یعمر المساجدا

یدأب فیہ قائما و قاعدا

و من یری عن الغبار حائدا

(جو مسجد تعمیر کرتا ہے کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اس مشقت کو برداشت کرتا ہے اور جو گرد و غبار کی وجہ سے اس کام سے گریز کرتا ہے وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔)

مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کے بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان عقدِ مواخات قائم کرایا تو حضرت علیؓ کو اپنا مواخاتی بھائی بنایا۔

غزوات کا آغاز ہوا تو چرخِ نیلی فام نے دیکھا کہ بدر ہو یا اُحد، خندق ہو یا خیبر ہر معرکے میں سیدنا علیؓ شمشیر بکف اور سینہ سپر سرفروشی کے جوہر دکھا رہے ہیں، جدھر جھک پڑتے ہیں دشمن کی صفیں کائی کی طرح پھٹ کر راستہ دے دیتی ہیں۔ ان کی خداداد شجاعت کو دوست اور دشمن سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ خود سیدنا علیؓ کا قول ہے کہ میدانِ رزم میں مجھے پروا نہیں ہوتی تھی کہ موت میری طرف آرہی ہے یا میں موت کی طرف جا رہا ہوں۔

رمضان المبارک ۲ھ میں سرورِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو سواریوں کی قلت کی وجہ سے دو دو تین تین آدمیوں کو ایک ایک اونٹ سواری کے لیے دیا گیا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ کے ساتھ سواری میں حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ شریک تھے۔ مولانا سعید انصاری نے "سیر الصحابہؓ" میں لکھا ہے کہ اسلامی لشکر کے جھنڈوں میں ایک جھنڈا حضرت علیؓ کے پاس تھا۔

جب حضورؐ میدانِ بدر کے قریب پہنچے تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو چند آزمودہ کار سرفروشوں کے ساتھ قریشِ مکہ کی نقل و حرکت کی ٹوہ لینے کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت علیؓ نے یہ اہم خدمت بڑی خوبی سے انجام دی۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے مشرکین کی صفوں سے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ تلواریں ہلاتے ہوئے نکلے اور مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ لشکرِ اسلام سے تین انصاری جانباز ان کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ قریشی جنگجوؤں کو جب معلوم ہوا کہ ان کے مقابل ہونے والے تینوں جانباز مدینہ کے باشندے ہیں تو انہوں نے ان سے لڑنا اپنی توہین سمجھا اور بآوازِ بلند کہا، "محمدؐ یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں ہیں ہماری قوم اور کفو کے لوگوں کو ہمارے مقابلے پر بھیجو۔"

اس پر حضورؐ نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث کو حکم دیا کہ جاؤ اور ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔ حضورؐ کا ارشاد سنتے ہی یہ تینوں بہادر اپنے حریفوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ نے آناً فاناً اپنے اپنے حریف کو خاک و خون میں لوٹا دیا۔ (حضرت علیؓ کا مدِ مقابل ولید بن عقبہ تھا) البتہ حضرت عبیدہؓ کو ان کے حریف نے زخمی کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ فوراً حضرت عبیدہؓ کی امداد کو پہنچ گئے اور ان کے حریف کو جہنم واصل کر کے زخمی عبیدہؓ کو میدانِ جنگ سے اٹھا لائے۔ عام لڑائی شروع ہوئی تو حضرت علیؓ کی تلوار دشمنوں کے لیے برقِ بے اماں بن گئی اور اس نے ان کے خرمنِ ہستی کو خاکستر کر دیا۔ مشرکین کو عبرتناک شکست ہوئی۔ ان کے ستّر آدمی میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور ستّر مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ اس لڑائی میں قریش کے جو مشہور جنگجو حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ ولید بن عتبہ، حارث بن ربیعہ، حنظلہ بن ابی سفیان، عقیل بن الاسود، نوفل بن خویلد، عاص بن سعید، حرملہ بن عمرو بن ابی عتبہ، ابو قیس بن الولید، مسعود بن ابی امیہ، عبداللہ بن ابی رفاعہ، حاجز بن سائب بن عویمر، نبیہ بن الحجاج، عاص بن منبہ، زمعہ بن الاسود، حارث بن زمعہ، عمرو بن عثمان بن کعب، مالک بن طلحہ، ابن تیم ان کے علاوہ کچھ اور مشرکین بھی تیغِ علیؓ کا شکار ہوئے۔ ایک مشرک عمرو بن ابی سفیان کو حضرت علیؓ نے قیدی بنایا۔ جنگ کے بعد حضورؐ نے مالِ غنیمت میں سے ایک اونٹ، ایک زرہ اور ایک تلوار حضرت علیؓ کو عطا فرمائی۔

اسی سال (۲ھ) میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے کر دیا اور دونوں میاں بیوی کے حق میں دعائے خیر و برکت فرمائی۔ چند ماہ بعد حضرت فاطمہؓ رخصت ہو کر حضرت علیؓ کے گھر گئیں تو

اس موقع پر حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"جانِ پدر! میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان کے بہترین شخص سے کی ہے۔" (ابنِ سعدؒ و طبرانیؒ)

۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا۔ لڑائی کے آغاز سے پہلے مشرکوں کے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ نے مبارزطلبی کی تو حضرت علیؓ اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔ ابنِ ابی طلحہ قریش کا نامی بہادر تھا لیکن شیرِ خداؓ نے اسے ایک ہی وار میں ڈھیر کر دیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے تکبیر کا نعرہ بلند کر کے اظہارِ مسرت فرمایا۔ اس کے بعد طلحہ بن ابی طلحہ کے دو بھائی اور تین بیٹے یکے بعد دیگرے میدان میں نکلے اور سب مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان کے بعد ارطاۃ بن شرجیل بنکارتا ہوا میدان میں آیا۔ حضرت علیؓ نے لپک کر اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ عام لڑائی شروع ہوئی تو حضرت علیؓ شروع سے آخیر تک میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر ڈٹے رہے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا تو مشرکین نے بڑھ بڑھ کر ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے شروع کر دیئے۔ اس موقع پر حضورؐ کے قریب جو جاں نثار موجود تھے انہوں نے آپؐ کی حفاظت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ علمبردارِ اسلام حضرت مصعبؓ بن عمیر کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر علم سنبھال لیا تھا۔ ایک موقع پر جب مشرکین چاروں طرف سے حضورؐ پر ٹوٹے پڑتے تھے حضرت علیؓ نے اس بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا کہ سب کا منہ پھر گیا۔ پھر ایک اور گروہ نے حضورؐ پر نرغہ کیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو بھی بھگا دیا۔ اس وقت لسانِ رسالتؐ سے یہ الفاظ ادا ہوئے:

"علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں۔"

ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ غزوۂ اُحد میں ابوسعید بن ابی طلحہ نے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی تو حضرت علیؓ اس کے مقابل ہوئے اور تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس کو زمین پر گرا دیا۔ اس کا سر قلم کرنے کے لیے دوسرا وار کیا ہی چاہتے تھے کہ وہ برہنہ ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے اس حالت میں اس کو قتل کرنا پسند نہ کیا اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ لڑائی میں حضورؐ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ جب مشرکین میدانِ جنگ سے ہٹ گئے اور صحابۂ کرامؓ حضورؐ کو پہاڑ پر لے گئے تو حضرت علیؓ ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے تھے اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ حضورؐ کے چہرۂ اقدس کا خون دھوتی تھیں۔ جب خون بند نہ ہوا تو حضرت فاطمہؓ نے چٹائی جلا کر راکھ زخم پر ڈالی۔

۴ھ ہجری میں یہود بنی نضیر نے عہد شکنی کی تو حضورؐ نے ان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں حضرت علیؓ حضورؐ کے ہمرکاب رہے اور اپنے شجاعانہ حملوں سے بنو نضیر کا ناطقہ بند کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کے لیے یہی سزا کافی سمجھی کہ انہیں خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا۔

۵ھ ہجری میں عرب کے مشرکین اور یہود متحد ہو کر مدینہ منوّرہ پر چڑھ آئے اور غزوۂ احزاب (خندق) پیش آیا۔ مسلمانوں نے خندق کھود کر کفار کے ٹڈی دل کو مدینہ منوّرہ میں گھسنے سے روک دیا لیکن وہ دور سے تیر اور پتھر برساتے رہتے تھے۔ ایک دن ان کے چند نامور جنگجوؤں نے خندق عبور کر لی۔ ان میں عمرو بن عبدِ ودّ بھی تھا جو ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا تو حضرت علیؓ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے

اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضورؐ نے یہ فرما کر ان کو بٹھا دیا کہ یہ عمرو بن عبدِ ودّ ہے۔ اس نے دوبارہ دعوتِ مبارزت دی تو حضرت علیؑ پھر کھڑے ہو گئے، لیکن حضورؐ نے اب کی بار بھی انہیں بٹھا دیا۔ تیسری دفعہ اس نے مسلمانوں کو للکارا تو حضرت علیؑ نے بے تاب ہو کر عرض کیا۔ "یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو بن عبدِ ودّ ہے مجھے اس کے مقابلے پر جانے دیجئے۔" اب حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی، اپنی تلوار مرحمت فرمائی اور اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھا۔ حضرت علیؑ دوڑتے ہوئے عمرو بن عبدِ ودّ کے مقابل ہوئے اور اس سے پوچھا، "کیا یہ تیرا قول ہے کہ جو شخص تجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ان میں سے ایک ضرور قبول کرے گا۔" اس نے کہا "ہاں" حضرت علیؑ نے فرمایا، "میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسلام لا" اس نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا، تو پھر میں تجھ سے اس بات کا خواستگار ہوں کہ مسلمانوں سے مت لڑ اور اپنے گھر جا کر آرام سے بیٹھ —— عمرو بن عبدِ ودّ نے کہا "اس طرح عرب کی عورتیں مجھ پر ہنسیں گی۔ میں نے نذر مان رکھی ہے کہ جب تک محمدؐ سے بدر کا بدلہ نہ لے لوں گا اپنے سر میں تیل نہیں ڈالوں گا۔ میں اپنی نذر پوری کیے بغیر پیچھے ہٹنے کا نہیں۔" حضرت علیؑ بولے "تو آ مجھ سے لڑ۔"

عمرو بن عبدِ ودّ نوے سال کا گرگِ باراں دیدہ تھا۔ حضرت علیؑ کی بات سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا یہ بات میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ عرب میں کوئی شخص مجھ سے نبرد آزما ہونے کی خواہش کرے گا۔ یہ کہہ کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا، کیونکہ حضرت علیؑ پیادہ تھے۔ پھر حضرت علیؑ سے پوچھا "تم کون ہو؟" انہوں نے اپنا نام بتایا تو بولا، "میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے اور تمہارے والد کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔" حضرت علیؑ نے گرج کر کہا:

"لیکن اے دشمنِ خدا میں تجھ سے لڑنا چاہتا ہوں۔"

عمرو اب جوشِ غضب سے بے قرار ہوگیا اور اس نے تلوار کا ایک بھرپور وار حضرت علیؓ پر کیا جس سے ان کی پیشانی زخمی ہوگئی۔ عمرو کے جواب میں حضرت علیؓ نے تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ وہ ڈھیر ہوگیا۔ اس کے گرتے ہی شیرِ خدا نے بآوازِ بلند تکبیر کہی۔ اب اس کے ساتھی آگے بڑھے لیکن وہ بھی حضرت علیؓ کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور بھاگ نکلے۔ ان میں سے ایک نوفل بن عبداللہ مخزومی خندق میں گر پڑا۔ مسلمانوں نے اس کو تیر اور پتھر مار کر ہلاک کرنا چاہا تو اس نے پکار کر کہا، میں شریفانہ موت چاہتا ہوں۔ تیروں اور پتھروں سے مجھے مت مارو۔ اس کی بات سن کر حضرت علیؓ خندق میں اُترے اور اس کو اپنی تلوار سے قتل کر دیا۔ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ اہلِ مکّہ نے نوفل کی لاش کے لیے دس ہزار درہم مسلمانوں کو پیش کیے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا:

"لاش دے دو قیمت درکار نہیں۔"

اس واقعہ کے چند دن بعد کفّار کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مایوسی اور نامرادی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر چلتے بنے۔ ان کے فرار کے بعد حضورؐ یہودِ بنو قریظہ کی طرف متوجہ ہوئے جو اثنائے محاصرہ میں غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ بقول زرقانیؒ حضورؐ نے اس مہم کا علمبردار حضرت علیؓ کو بنایا۔ انہوں نے بنو قریظہ کے قلعے پر قبضہ کر کے اس کے صحن میں نمازِ عصر ادا کی۔

شعبان ۶ھ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ بنو سعد بن بکر یہودِ خیبر کو لڑائی کے لیے اُبھار رہے ہیں اور خود بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو دو سو سوار دے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے طوفانی یلغار کر کے بنو سعد کو کمر شکن شکست دی اور سو

(بروایتِ دیگر پانچ سو) اونٹ اور دو ہزار بکریاں مالِ غنیمت میں لائے۔ یہ مہم "سریہ فدک" کے نام سے مشہور ہے۔

ذیقعد ۶ھ میں حضرت علیؓ کو "بیعتِ رضوان" میں شریک ہونے کا عظیم الشان شرف حاصل ہوا۔ اس بیعت کے شرکا کو "اصحاب الشجرہ" کہہ کر پکارا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں انہیں اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت دی ہے۔ اسی موقعہ پر صلحنامۂ حدیبیہ معرضِ تحریر میں آیا۔ حضورؐ کے حکم کے مطابق اس کی کتابت حضرت علیؓ نے کی۔ "صلحنامہ" میں جب "محمد رسول اللہ" کے الفاظ آئے تو مشرکین نے اعتراض کیا کہ ہم محمدؐ کو رسول اللہ تسلیم نہیں کرتے اس لیے "رسول اللہ" کا لفظ صلحنامہ میں نہیں آنا چاہیئے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا۔

"علی، رسول اللہ کا لفظ عبارت سے محو کر دو۔"

ان کی غیرتِ دینی کو یہ گوارا نہ ہوا، بصد ادب عرض پیرا ہوئے۔ "یا رسول اللہ خدا کی قسم یہ کام مجھ سے نہ ہو گا" ___ حضورؐ نے ان کے جذبات کی قدر فرماتے ہوئے خود اپنے دستِ مبارک سے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا۔ (صحیح بخاری)

اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ میں خیبر پر لشکر کشی ہوئی تو حضرت علیؓ بھی حضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ خیبر میں یہودیوں کے کئی مضبوط قلعے تھے اور قلعے تو جلد فتح ہو گئے لیکن حصنِ قموص کسی طرح فتح ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس قلعہ کا حاکم ایک نامور یہودی رئیس مرحب نامی تھا جو قوت اور شجاعت میں اپنی مثال آپ تھا۔ جب کئی اکابر صحابہؓ کو "حصن القموص" مسخر کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تو ایک دن شام کے وقت حضورؐ نے فرمایا:

"کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جو اللہ کے رسول کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول اس کو محبوب

رکھتے ہیں۔"

سب صحابہؓ نے رات اس انتظار میں کاٹی کہ دیکھیں یہ سعادت کس کو نصیب ہوتی ہے۔ صبح ہوئی تو حضورؐ نے حضرت علیؑ کو بلا بھیجا۔ وہ اس وقت آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ حضرت سلمہؓ بن الاکوع انہیں سہارا دے کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں لائے۔ آپؐ نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا، جس سے یہ شکایت فوراً دُور ہوگئی۔ اب آپؐ نے انہیں عَلَم عطا فرمایا اور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ نے عرض کی "یا رسول اللہ کیا یہود کو بزورِ شمشیر مسلمان بنا لوں؟" حضورؐ نے فرمایا۔ "نہیں ان کو نرمی سے اسلام کی دعوت دو اگر تمہاری تبلیغ سے ایک شخص بھی راہِ ہدایت پر آگیا تو تمہارے لیے بڑی سے بڑی نعمت سے بہتر ہے۔"

حضرت علیؑ نے حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل کی لیکن یہودی لڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کا سردار مرحب سر پر زرد رنگ کا مغفر اور اس پر سنگی خود سجائے یہ رجز پڑھتا ہوا قلعے سے نکلے۔

قد علمت خیبر انی مرحب شاکی السلاح بطل مجرب

اذا الحروب اقبلت تلھب

(خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، ہتھیاروں سے لیس، بہادر اور تجربہ کار ہوں جب لڑائیوں کے شعلے بھڑکتے ہیں)

اس کے مقابلے کے لیے حضرت علیؑ یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ کلیث غابات کریہ المنظرہ

اوفیھم بالصاع کیل السندرہ

(میں وہ ہوں جس کا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے، جھاڑیوں کے شیر جیسا ہیبت ناک اور ڈراؤنا۔ میں دشمنوں کو آنِ واحد میں ٹھکانے لگا دیتا ہوں)

مرحب نے غضب ناک ہو کر حضرت علیؑ پر حملہ کیا لیکن اللہ کے اس شیر نے اپنی تلوار کے ایک ہی بھرپور وار سے اس کا سر دو ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بڑھ کر قلعے پر حملہ کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اتفاق سے ان کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، انہوں نے قلعے کا دروازہ اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت علیؑ کی محیّر العقول شجاعت کی بدولت قلعہ فتح ہو گیا۔

یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد وہ حضورؐ کی خدمت میں واپس آئے تو آپؐ نے خیمے سے باہر نکل کر انہیں اپنے کنارِ شفقت میں لے لیا اور پیشانی چوم کر فرمایا:

" رضی اللہ عنک ورضیت عنک " ارشادِ نبویؐ سن کر حضرت علیؑ فرطِ مسرت سے رونے لگے۔

امام محمد بن اسحاقؒ، موسیٰ بن عقبہؒ، واقدیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن کثیرؒ اور کچھ دوسرے اہلِ سیر کا بیان ہے کہ مرحب کو حضرت محمدؓ بن مسلمہ انصاری نے قتل کیا۔ لیکن صحیح بخاری (مطبوعہ مصر۔ جلد ۲ باب غزوۂ ذی قرد وغیرہ) صحیح مسلم، مسندِ احمد حنبلؒ، مستدرکِ حاکم، تاریخ الخلفاء (سیوطیؒ) اور متعدد دوسری کتابوں میں حضرت علیؑ ہی کو مرحب کا قاتل بیان کیا گیا ہے، اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے "سیرۃ النبیؐ" میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

> " ابنِ اسحاقؒ، موسیٰ بن عقبہؒ اور واقدیؒ کا بیان ہے کہ مرحب کو محمدؓ بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسندِ احمد حنبلؒ اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہیں۔"

۸ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر لشکر کشی کا ارادہ فرمایا۔ آپؐ اہلِ مکہ کو اپنے عزم سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے، لیکن ایک بدری صحابی

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے اس خیال سے اہلِ مکہ کو حضورؐ کے ارادے سے مطلع کرنا چاہا کہ وہ ان کے ممنونِ احسان ہو جائیں اور مکہ میں مقیم ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہ پہنچائیں۔ انہوں نے ایک خط لکھ کر مکہ کی ایک عورت کے حوالے کیا کہ وہ اسے سردارانِ قریش تک پہنچا دے۔ اس کے روانہ ہونے کے بعد حضورؐ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت علیؑ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو حکم دیا کہ وہ اس عورت کا تعاقب کریں اور اس سے خط چھین کر لائیں۔ یہ تینوں بہادر گھوڑے اڑاتے مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور روضۂ خاخ کے مقام پر اس عورت کو جا پکڑا۔ پہلے تو اس نے خط سے لاعلمی ظاہر کی لیکن جب حضرت علیؑ نے اسے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو اس نے اپنے بالوں کے جوڑے سے خط نکال کر انہیں دے دیا ——— وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے حضرت حاطبؓ سے جواب طلبی کی۔ انہوں نے خط بھیجنے کا پس منظر بلا کم و کاست عرض کر دیا۔ حضورؐ نے ان کا عذر قبول فرما لیا اور معاملہ رفت گزشت ہو گیا۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت علیؑ ان دس ہزار سرفروشوں میں شامل تھے جن کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا اور جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے "کتابِ استثنا" میں یوں پیشین گوئی کی گئی تھی:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ کوہِ فاران سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں (یعنی نورانی) شریعت تھی۔"

"مستدرکِ حاکم" میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد کعبہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑا تو تانبے سے بنا ہوا سب سے بڑا بت رہ گیا۔ کیونکہ یہ لوہے کی ایک سلاخ کے ساتھ زمین سے پیوست تھا۔ حضورؐ نے حضرت علیؑ کے کندھوں پر چڑھ کر اس کو

توڑنا چاہا، لیکن وہ نہایت قوی الجثہ اور شہزور ہونے کے باوجود حضورؐ کے جسمِ اطہر کا بار سہار نہ سکے۔ اس پر حضورؐ نے انہیں کا شانۂ اقدس پر چڑھا کر اس بُت کو گرانے کا حکم دیا۔ انہوں نے سلاخ اکھاڑ کر اس بُت کو گرادیا۔

فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین پیش آیا۔ اس میں بنو ہوازن کی بے پناہ تیراندازی سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا تو حضرت علیؓ ان جاں بازوں میں تھے جن کے پائے استقلال میں لمحہ بھر کے لیے بھی لغزش نہ آئی اور جو شروع سے اخیر تک حضورؐ کی ہمرکابی میں دادِ شجاعت دیتے رہے یہاں تک کہ بنو ہوازن خاک چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔

۹ ہجری میں حضورؐ نے حضرت علیؓ کو ایک سو پچاس (اور بروایت دیگر صرف پچاس) سوار دے کر بنو طے کی طرف روانہ کیا۔ بنو طے کے سردار عدیؓ بن حاتم طائی شام کی طرف بھاگ گئے۔ دوسرے اہلِ قبیلہ نے معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ حضرت علیؓ بہت سے قیدی اور کثیر مالِ غنیمت لے کر مدینہ واپس آئے۔ قیدیوں میں سفانہ دخترِ حاتم طائی بھی تھیں، وہ حضورؐ کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئیں۔ آپؐ نے انہیں اور دوسرے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ سفانہؓ نے شام جا کر حضرت عدیؓ کو بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کی ترغیب دی۔ وہ مدینہ آئے اور حضورؐ سے ملاقات کے بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اسی سال حضورؐ غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت علیؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین بنایا۔ صحیح بخاری میں حضرت مصعب بن سعدؓ سے روایت ہے کہ لشکرِ اسلام کی روانگی کے بعد حضرت علیؓ نے منافقین کے طعنے سنے تو وہ نہایت تیز رفتاری سے لشکر کے پیچھے روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ لشکر کو پالیا۔ اس وقت طویل سفر اور سخت گرمی کی وجہ سے ان کے پاؤں سوج گئے تھے اور تلووں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر شریکِ جہاد ہونے کی اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا:

"الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ هارونؑ من موسیٰ الا انه لیس نبی بعدی۔"

(کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ویسے ہو جیسا کہ موسیٰؑ کے لیے ہارون تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)

ارشادِ نبویؐ سن کر حضرت علیؓ نے خوش و خرم مدینہ منوّرہ کو مراجعت کی۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ تبوک سے واپسی کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیرِ حج بنا کر مکہ روانہ فرمایا۔ اسی اثناء میں سورہ برأت نازل ہوئی تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو یہ ذمہ داری تفویض فرمائی کہ وہ مکہ جا کر حج کے اجتماع میں یہ سورۃ لوگوں کو سنائیں۔ حضرت علیؓ نے مکہ جا کر یہ سورۃ لوگوں کو سنائی اور حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی مشرک خانۂ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ نہ کوئی ننگا ہو کر حج کر سکے گا اور مشرکوں کے ساتھ تمام معاہدے آج سے چار ماہ بعد ختم ہو جائیں گے۔ حجۃ الوداع سے کچھ عرصہ قبل حضورؐ نے حضرت علیؓ کو یمن کے مشہور قبیلہ ہمدان کی طرف داعیِ اسلام بنا کر روانہ فرمایا۔ ان سے پہلے حضرت خالدؓ بن ولید ان لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے لیکن ان کی مسلسل چھ ماہ کی تبلیغ کے باوجود بنو ہمدان اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرت علیؓ یمن گئے تو اس انداز سے لوگوں کو دعوتِ توحید دی کہ وہ بلا تامّل حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو قاضی بنا کر یمن روانہ فرمایا تھا اور تحصیلِ خراج کی خدمت بھی ان کے سپرد فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے فرائض بحُسن و خوبی انجام دیئے اور ایک مرتبہ وہاں سے حضورؐ کی خدمت میں کچھ سونا بھی بھیجا جو آپؐ نے چار (مؤلفۃ القلوب) صحابہؓ میں تقسیم فرما دیا۔

سنہ ۱۰ھ میں حضرت علیؓ یمن سے آ کر حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری

میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ یمن سے حجۃ الوداع میں شرکت کے لیے آئے تو حضورؐ نے ان سے پوچھا، "اے علیؓ تم نے احرام کس طرح باندھا ہے؟" انہوں نے عرض کیا، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے۔" فرمایا "ہدی بھیجو اور محرم رہو۔"

حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدی کے اونٹ ہدیہ میں پیش کیے۔

کتاب الحج (بخاری) میں خود حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کا نگران بنایا۔ میں نے آپ کے حکم سے ان کا گوشت تقسیم کیا، پھر آپؐ کے حکم سے ان کی جھولیں اور کھالیں تقسیم کیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی کے سفر میں حضورؐ نے "خم" نامی ایک تالاب (غدیر) پر قیام فرمایا۔ یہیں تمام صحابہؓ کے سامنے ایک مختصر خطبہ دیا جس میں دوسرے ارشادات کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

"جس کا میں مولا ہوں علیؓ بھی اس کا مولا ہے۔ الٰہی جو علیؓ سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ، اور جو علیؓ سے عداوت رکھے تو بھی اس سے عداوت رکھ۔"

بعض علماء نے ان روایتوں پر تنقید کی ہے، لیکن علامہ شبلی نعمانیؒ نے "سیرۃ النبی" میں انہیں صحیح تسلیم کیا ہے۔ اگر "غدیر خم" والی روایات کی صحت میں کلام بھی کیا جائے تو بھی حضرت علیؓ کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ اصحاب عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں اور ان کے دوسرے فضائل و مناقب بھی کچھ کم نہیں۔ ان میں سے بیشتر فضائل و مناقب ایسے ہیں کہ ان پر سب مکاتب فکر کا اتفاق ہے۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؓ کو تین سو سوار دے کر یمن کے قبیلہ مذحج کی طرف اس ہدایت کے ساتھ روانہ فرمایا کہ طاقت کا استعمال

صرف اسی صورت میں کرنا کہ وہ لوگ سرکشی کا مظاہرہ کریں۔ حضرت علیؑ نے یمن پہنچ کر قبیلہ مذحج کو اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے اس کا جواب تیروں اور پتھروں سے دیا۔ ان کی یہ حرکت ناقابلِ برداشت تھی۔ شیرِ خدا نے ایک ہی ہلّے میں ان کے کس بل نکال دیئے اور وہ اپنے متعدد آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان کے سربرآوردہ آدمی حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت علیؑ مدینہ منوّرہ واپس آئے تو حضورؐ کی علالت کا آغاز ہو چکا تھا، چند دن بعد آفتابِ رسالت اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب ہو گیا۔ حضرت علیؑ کے لیے یہ جانکاہ صدمہ تھا لیکن انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ مسندِ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت علیؑ نے جسدِ اطہر کو غسل دیا اور حضرت عباسؓ، قثم بن عباسؓ، فضل بن عباسؓ اور حضرت اوس بن خولی انصاری نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ غسل دیتے وقت انہوں نے حضورؐ کے جسدِ اقدس کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ قبر مبارک تیار ہو گئی تو انہوں نے فضل بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے ساتھ مل کر جسدِ پاک کو قبر میں اتارا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ انتیس (۲۹) برس حیات رہے۔ اس عرصے میں ان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے جن کی تفصیل کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ اس زمانے کے بعض واقعات اور ان کے اسباب و علل کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان شدید اختلافِ رائے پایا جاتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی تمام مکاتبِ فکر کے علماء حضرت علیؑ کی عظمت، فضل و کمال اور ان کی پاکیزہ سیرت و کردار کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سربرآرائے خلافت ہوئے تو قطع نظر اس کے کہ حضرت علیؑ نے فوراً ان کی بیعت کر لی یا اس میں چند ماہ توقف کیا، مستند روایات

سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات انتہائی خوشگوار تھے اور دونوں ایک دوسرے کا غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ علامہ زمخشریؒ نے تو اپنی کتاب "الموافقۃ بین اہل البیت والصحابہ" میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضورؐ کے وصال کے چند ماہ بعد حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے وفات پائی تو حضرت علیؓ کے اصرار پر ان کی نماز جنازہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پڑھائی۔ بعض علماء نے اس روایت پر تنقید کی ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ فتنۂ ردّہ کے زمانہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جن صحابہؓ کو مدینہ منوّرہ کی حفاظت پر مامور فرمایا ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے اور انہوں نے یہ خدمت بخوشی انجام دی۔

حضرت علیؓ کے دل میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کس قدر محبت اور عظمت تھی، اس کا اندازہ اس خطبہ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد اس مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیا جس میں صدیق اکبرؓ کی میت رکھی ہوئی تھی۔ علامہ محب الدین طبریؒ نے اپنی کتاب "الریاض النضرہ" میں یہ پورا خطبہ نقل کیا ہے اس کے چند حصے ملاحظہ ہوں۔

"اے ابوبکر تم پر خدا کی رحمت، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب، مونس، معتمد اور مشیر تھے۔ تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور سب سے بڑھ کر دین کو نفع پہنچانے والے تھے۔ تم نے آپؐ کے ساتھ اس وقت غمخواری کی جب اوروں نے تنگ دلی دکھائی۔ جب لوگ مصائب کی وجہ سے دل شکستہ ہو رہے تھے تم آپؐ کی مدد پر قائم رہے۔ تم دو میں سے ایک تھے اور غار میں رفیق۔ تمہاری آواز سب سے دھیمی، تمہارا کلام سب سے زیادہ باوقار۔ تمہاری گفتگو سب سے زیادہ باصواب۔ تمہاری خاموشی سب سے زیادہ طویل اور تمہارا

قول سب سے زیادہ بلیغ تھا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر اس وقت بھی قائم رہے جب لوگ مضطرب ہو گئے۔ تم کافروں کے لیے عذاب اور قہر تھے اور مومنوں کے لیے سراپا رحمت۔ تم اس پہاڑ کی مثل تھے جس کو نہ شدائد ہلا سکتے ہیں اور نہ ہوا کے طوفان ہٹا سکتے ہیں۔ عاجز اور درماندہ تمہارے نزدیک قوی اور معزز تھا کہ تم اس کا حق دلا کر چھوڑتے تھے اور زبردست تمہارے نزدیک کمزور اور ناچیز تھا کہ تم اس سے دوسروں کا چھینا ہوا حق لے کر رہتے تھے۔ واللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تمہاری وفات سے بڑھ کر مسلمانوں پر کوئی مصیبت نہیں پڑے گی۔ تم دین کی عزت حفاظت اور پناہ تھے۔ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا دے اور ہم کو تمہارے اجر سے محروم اور تمہارے بعد گمراہ نہ فرمائے۔"

حضرت علیؓ کا خطبہ ختم ہوا تو لوگ بے اختیار رونے لگے۔ چند ماہ بعد حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس سے نکاح کر لیا اور ان کے بطن سے حضرت ابوبکرؓ کے فرزند محمد بن ابی بکر کی نہایت محبت اور شفقت سے پرورش کی۔ حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے حضرت علیؓ کو اپنا مشیرِ خاص بنایا۔ دونوں میں اس قدر محبت و یگانگت تھی کہ تمام کام باہمی مشورے سے کرتے تھے۔

سنہ ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ بیت المقدس گئے تو حضرت علیؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین اور قائم مقام بنایا۔ اپنی وفات سے پہلے انہوں نے جن چھ اصحاب کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی لختِ جگر اُمِ کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر

دیا تھا۔ (ابن جریر طبریؒ، ابن حبانؒ، ابن قتیبہؒ، ابن اثیرؒ)

حضرت عمرؓ نے وفات پائی تو حضرت علیؓ بادیدۂ نم ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کا جنازہ تابوت میں رکھا گیا کہ ایک شخص نے میرے پیچھے سے آ کر اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور کہا، عمر خدا تمہارے حال پر رحم کرے، میرا بھی خیال تھا کہ اللہ تم کو تمہارے دونوں ساتھیوں کے ساتھ رکھے گا اس لیے کہ کئی بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنا کہ "میں ابوبکر اور عمر۔ یا میں ابوبکر اور عمر نے یہ کام کیا یا فلاں جگہ گئے۔" میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علیؓ تھے۔

حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں بھی حضرت علیؓ ان کو مخلصانہ مشورے دیتے رہے۔ ان بزرگوں کے ساتھ حضرت علیؓ کے تعلقِ خاطر کی یہ کیفیت تھی کہ انہوں نے اپنے تین صاحبزادوں کے نام ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے۔ ابوبکر (جو لیلیٰ بنت مسعود کے بطن سے تھے) اور عثمان (جو ام البنین کے بطن سے تھے) سیدنا حسینؓ کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے۔ عمر نے پچاس برس کی عمر میں ینبوع میں وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو (کچھ دوسرے جوانانِ قریش کے ساتھ) ان کی حفاظت پر مامور فرمایا لیکن باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر مکان کے اندر گھس گئے اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی شہادت کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا۔

۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی لیکن انہوں نے تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور خلافتِ راشدہ کی کشتی کو گردابِ بلا سے نکالنے کے لیے کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہیں کیا۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم نے اپنی کتاب "قول سدید" میں امیر المومنین حضرت علیؑ کی استقامت اور شانِ جہانبانی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"اتنی زبردست مشکلات میں گھرے ہونے پر دوسرا شخص شاید اوسان کھو بیٹھتا مگر اللہ رے عزم و استقامت، یہ دن کا شہسوار اور رات کا راہب ایک طرف فوجوں کی کمان کر رہا ہے دوسری طرف محرابِ عبادت میں بہ کمالِ خضوع سجدہ ریز ہے ــــ کبھی دارالعدالت میں مشکل مقدمات کے فیصلے سنا رہا ہے اور کبھی مسجدِ رحبہ (کوفہ) میں مواعظ و حکم کے موتی لٹا رہا ہے۔"

حضرت علیؑ نے مسندِ خلافت پر قدم رکھا تو سب سے پہلے ان کو "خونِ عثمانؓ" کے قصاص کا معاملہ پیش آیا۔ شریعت کے مطابق ارتکابِ جرم کے ثبوت میں ایسے معتبر گواہوں کا ہونا لازمی ہے جنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے مجرموں کو قتل کرتے دیکھا ہو۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت صرف ان کی اہلیہ حضرت نائلہؓ ان کے پاس موجود تھیں، وہ صرف یہ بتا سکیں کہ تین آدمی اندر آئے جن میں سے ایک محمدؓ بن ابی بکرؓ تھے۔ حضرت علیؑ نے انہیں پکڑ کر پوچھا تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ وہ قتل کے ارادے سے کاشانۂ خلافت میں ضرور داخل ہوئے تھے لیکن جب حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ "بھتیجے تمہارے باپ زندہ ہوتے تو ان کو تمہاری یہ حرکت پسند نہ آتی"، تو وہ شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ آئے۔ دوسرے دو آدمیوں کو وہ بھی نہیں جانتے۔ غرض تحقیق و تفتیش کے باوجود اصل قاتلوں کا پتہ نہ چل سکا اور حضرت علیؑ اسلام کے قانونِ شہادت کے مطابق کسی پر حدِ شرعی جاری نہ کر سکے۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش میں حصہ لیا تھا بہت بڑی تعداد میں حضرت علیؑ کے لشکر میں شامل ہو گئے لیکن حالات

نے اتنی تیزی سے کروٹ لی کہ حضرتِ والاؓ کو تطہیرِ لشکر کی مہلت ہی نہ ملی اور بعض اصحاب انہیں "خونِ عثمانؓ" میں شریک جاننے لگے۔ اسی غلط فہمی کے نتیجے میں "جمل" کی افسوسناک لڑائی پیش آئی۔ اس کا فیصلہ حضرت علیؓ کے حق میں ہوا تو انہوں نے عام اعلان کر دیا کہ نہ مالِ غنیمت لوٹا جائے، نہ بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے اور نہ کسی ہتھیار ڈالنے والے سے تعرض کیا جائے۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی مزاج پُرسی کی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ انہیں مدینہ منورہ بھیج دیا۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کا بہت سا وقت امیر معاویہؓ کے ساتھ لڑائیوں میں صرف ہوا۔ ان لڑائیوں میں حضرت علیؓ کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اس کا اندازہ ابن اثیرؒ کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک موقع پر شامی فوج نے دریا کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؓ کی فوج کو پانی لینے سے روک دیا، لیکن جب علوی فوج نے شامیوں کو پیچھے دھکیل کر گھاٹ پر قبضہ لیا تو حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ شامیوں کو پانی لینے سے ہرگز نہ روکا جائے۔ صفین کے مقام پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی فوجوں کے درمیان عرصے تک خونریز جھڑپیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ واقعۂ تحکیم پیش آیا اس کے نتیجے میں امن تو قائم ہو گیا لیکن خوارج کا فرقہ پیدا ہو گیا جو حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص، سب کا دشمن تھا۔ حضرت علیؓ نے شروع شروع میں ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر کی اور فساد برپا کرنا شروع کر دیا تو حضرت علیؓ نے پوری قوت سے ان کی سرکوبی کی اور نہروان کی لڑائی میں انہیں عبرتناک شکست دے کر ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس گروہ (خوارج) کو جمہور صحابۂ کرامؓ واجب القتل سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ انہیں بدترین مخلوق سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان لوگوں نے قرآن

کی وہ آیات جو کفار کے لیے نازل ہوئیں مسلمانوں پر منطبق کر دیں۔

بعض لوگ جنگ جمل اور جنگ صفین کے سلسلے میں حضرت علیؑ پر زبان طعن دراز کرتے ہیں، ان کو سیاست سے نابلد قرار دیتے ہیں اور ان کی عظمت و مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے عہد کے ایک نامور عالم اور مصنف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے نہایت بلیغ انداز میں ان لوگوں کی روش پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:-

"باوجود دیکھنے کے جو نہیں دیکھنا چاہتے ان کو کیسے دکھایا جا سکتا ہے۔ حضرت علیؑ پر تنقید کرنے والوں کی طرف سے جب اس قسم کی باتیں میرے کانوں میں پہنچتی ہیں تو ہمیشہ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ علیؑ کی پچھلی زندگی پر تنقید کرنے والے ان کی زندگی کی ابتدائی خدمات سے اپنے آپ کو اندھا کیوں بنا لیتے ہیں، وہ اسلامی اٹلس میں ایران و مصر و شام و عراق کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قادسیہ میں جو کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوئی کیا بدر کی فیصلہ کن کامیابی کے بغیر نصیب ہو سکتی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ یرموک ندی کے ساحل پر معجزانہ شکست ان کے دشمنوں کو اٹھانا پڑی لیکن یرموک کی خوشی پر شادیانے بجانے والوں سے کوئی پوچھے کہ ارے محسن کشو! یرموک تک تم پہنچ بھی سکتے تھے اگر کھولنے والا تم پر خیبر کے پہاڑی قلعوں کے دروازوں کو نہ کھول دیتا۔"

اندرونی شورشوں کی وجہ سے اگرچہ حضرت علیؑ اسلامی فتوحات کے دائرہ کو زیادہ وسیع نہ کر سکے پھر بھی وہ اس طرف سے غافل نہ رہے، کرمان و فارس کی بغاوتیں فرو کیں، کابل و سیستان پر اسلامی قبضہ مستحکم کیا اور مسلمانوں کو بحری راستے سے ہندوستان کی طرف پیشقدمی کی اجازت دی۔ انھوں نے ملک کا نظم و نسق بھی ایسے احسن طریقے سے چلایا جو ایک "خلیفۂ راشد" ہی کے شایان شان ہو سکتا تھا۔ ان

کے عظیم کردار اور شانِ جہانبانی کا اندازہ اس تصویر سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے ایک رفیقِ قدیم ضرار بن ضمرہ اسدی نے امیر معاویہؓ کے دربار میں کھینچی۔ امیر معاویہؓ نے ضرار اسدی سے حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ان کے خصائل اور معمولات کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

"بڑے بلند نظر، بڑے عالی ہمت، بڑے طاقتور، جچی تلی گفتگو فرماتے حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرتے۔ زبان و دہن سے علم کا چشمہ اُبلتا، ہر ہر ادا سے حکمت ٹپکتی۔ دنیا اور بہارِ دنیا سے وحشت تھی رات اور رات کی تاریکی میں خوش رہتے۔ آنکھیں پُرآب، ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے، رفتارِ زمانہ پر متعجب، نفس سے ہر وقت مخاطب، کپڑا وہ مرغوب تھا جو معمولی اور موٹا جھوٹا ہو۔ غذا وہ مرغوب تھی جو غریبانہ اور سادہ ہو۔ کوئی امتیازی نشان پسند نہیں کرتے تھے۔ جماعت کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔ ہم سوال کرتے تو جواب دیتے تھے۔ ہم حاضر ہوتے تو سلام اور مزاج پُرسی میں پہل کرتے۔ ہم مدعو کرتے تو دعوت قبول فرماتے، لیکن اس قربِ مساوات کے باوجود رعب کا یہ عالم تھا کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور سلسلۂ سخن کا آغاز کرنا مشکل ہوتا۔ اگر کبھی مسکراتے تو دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے۔ دیندار دل کی عزت اور مسکین سے محبت کرتے تھے لیکن اس تواضع اور مسکنت کے باوجود کسی طاقتور اور دولت مند کی یہ مجال نہ تھی کہ ان سے غلط فیصلہ کروا لے یا ان سے کوئی رعایت حاصل کرے اور کمزور کو ہر وقت ان کے عدل و انصاف کا بھروسا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک شب ان کو ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے

اپنی ظلمت کے پردے ڈال دیئے تھے اور ستارے ڈھل چلے تھے، آپ اپنی مسجد کے محراب میں کھڑے تھے۔ ڈاڑھی مٹھی میں تھی۔ اس طرح تڑپ رہے تھے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اس طرح رو رہے تھے جیسے دل پر کوئی چوٹ لگی ہو۔ اس وقت میرے کانوں میں ان کے الفاظ گونج رہے ہیں، اے دنیا، اے دنیا کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے اور مجھے بہکانے کی ہمت ہے، مایوس ہو جا، کسی اور کو فریب دے، میں نے تو تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیرا عیش بے حقیقت، تیرا خطرہ زبردست، ہائے زادِ راہ کس قدر کم ہے، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے۔"

ضرار کی یہ تقریر سن کر امیر معاویہؓ رونے لگے اور کہا، "خدا ابوالحسن پر رحم کرے۔ واللہ وہ ایسے ہی تھے۔" پھر امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا، "اے ضرار تم کو ان کا کتنا غم ہے؟" انہوں نے کہا "جتنا اس عورت کو ہو جس کا اکلوتا بیٹا اس کی گود میں ذبح کر دیا گیا ہو۔"

حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

امیرالمومنینؓ کے بھائی حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کو روپے کی ضرورت تھی انہوں نے حضرت علیؓ کے سامنے اپنی ضرورت بیان کی، فرمایا تم جانتے ہو میرے پاس روپیہ کہاں، بولے، بیت المال سے قرض دلوا دیجیے، ارشاد ہوا "میں اللہ کے سامنے چور بننا نہیں چاہتا۔ اس معاملہ میں تم، حسنؓ اور عام آدمی میرے لیے برابر ہیں۔" حضرت والاؓ کے فقر و زہد اور احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عقیلؓ ان کا ساتھ چھوڑ کر امیر معاویہؓ کے پاس چلے گئے۔

ایک دفعہ عبداللہ بن زریر نامی ایک صاحب شریک طعام ہوئے دسترخوان پر نہایت سادہ کھانا تھا۔ انہوں نے عرض کیا "امیرالمومنین آپ کو پرندوں کے گوشت کا شوق نہیں؟" فرمایا، "ابن زریر! خلیفۂ وقت کو مسلمانوں کے مال میں صرف دو پیالوں کا حق ہے، ایک خود کھائے اور کھلائے اور دوسرا عامۃ الناس کے سامنے پیش کرے۔" (ازالۃ الخفاء) ایک دفعہ اصفہان سے مال آیا تو انہوں نے اس کے سات حصے کیے۔ اس میں ایک روٹی بھی تھی، اس کے بھی سات ٹکڑے کئے اور ہر حصے پر ایک ایک ٹکڑا تقسیم کیا، پھر قرعہ ڈال کر تمام حصے تقسیم کیے۔

ایک دفعہ اپنے غلام قنبر کو ساتھ لے کر کپڑا خریدنے تشریف لے گئے۔ اپنے لیے معمولی موٹا کپڑا اور قنبر کے لیے اچھا ملائم کپڑا انتخاب کیا۔ قنبر نے تامل کیا تو فرمایا "تم جوان ہو تمہارے لیے اچھا کپڑا مناسب ہے، میرا کیا ہے بوڑھا آدمی ہوں۔"

ایک مرتبہ عید سے پہلے لوگوں نے عرض کیا " امیرالمومنین آپ کے لباس میں پیوند لگے ہیں۔ اگر آپ دو درہم میں کپڑوں کا ایک جوڑا خرید لیں اور عید کے دن اسے پہن لیں تو کیا اچھا ہو؟" فرمایا، " مجھے شرم آتی ہے کہ میں نئے کپڑے پہنوں اور کوفہ میں ہزاروں اشخاص بوسیدہ لباس میں ہوں۔"

ایک دفعہ بیت المال میں جو کچھ تھا، امیرالمومنین نے اس کو مسلمانوں میں تقسیم کردیا اور اس میں جھاڑو دے کر دو رکعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد فرمایا، " اے زمین تو گواہ رہ کہ میں نے مسلمانوں کی امانت ادا کر دی۔"

ایک مرتبہ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا " کون میری یہ تلوار خریدتا ہے، خدا کی قسم اگر میرے پاس ایک تہ بند کی قیمت ہوتی تو اس کو فروخت نہ کرتا۔" ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا، " امیرالمومنین میں تہ بند کی قیمت قرض دیتا ہوں۔"

ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ ایام خلافت میں امیرالمومنین علیؑ چھوٹی آستین اونچے

دامن کا کرتہ اور معمولی تہ بند باندھے بازار میں گشت کرتے پھرتے۔ اگر کوئی تعظیماً پیچھے ہو لیتا تو اس کو ہٹا دیتے اور فرماتے۔ "اس میں حاکم کے لیے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت ہے۔"

جب کہیں سے مال آتا تو سارے کا سارا مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ نہ اپنے لیے کوئی خاص چیز منتخب کرتے اور نہ تقسیم میں اپنے اعزہ و اقربا کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سے نارنگیاں آئیں، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے ایک ایک نارنگی اٹھا لی۔ امیر المومنینؑ نے نارنگیاں ان سے چھین لیں اور لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے جب دار الخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کیا، تو دار الامارت کے بجائے ایک میدان میں خیمہ لگا کر اس میں قیام کیا اور فرمایا، عمر بن الخطاب نے ہمیشہ ہی ان عالیشان محلوں کو نظر حقارت سے دیکھا مجھے بھی ان کی حاجت نہیں بعد میں ایک معمولی مکان کو اپنا مسکن بنایا۔ دروازے پر نہ کوئی حاجب تھا اور نہ کوئی دربان۔ ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

ابن ابی رافع سے روایت ہے کہ میں امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب کے بیت المال کا نگران تھا۔ ایک مرتبہ بصرہ سے موتیوں کا ایک ہار آیا۔ امیر المومنینؑ کی صاحبزادی نے یہ ہار مجھ سے عاریتاً مانگ بھیجا کہ وہ اسے عید کے دن پہن کر واپس کر دیں گی۔ میں نے یہ ہار انہیں بھیج دیا۔ امیر المومنین کی نظر اس ہار پر پڑی تو انہوں نے بیٹی سے پوچھا "یہ کہاں سے آیا ہے؟" انہوں نے واقعہ بیان کیا تو امیر المومنین نے مجھ سے فرمایا، ابن ابی رافع تم خیانت بھی کرنے لگے؟ میں نے عرض کیا، معاذ اللہ، فرمایا، تم نے میری بیٹی کو بیت المال کا ہار عاریتاً کیسے دے دیا نہ مجھ سے اجازت لی، نہ مسلمانوں سے۔ میں نے عرض کیا وہ آپ کی صاحبزادی ہیں انہوں نے ایک چیز مانگی اور میں نے تین دن بعد صحیح و سالم واپسی کی شرط پر انہیں دے دی۔ ارشاد ہوا ابھی

واپس لو۔ اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو سزا سے نہیں بچ سکو گے۔ میری بیٹی نے یہ ہار عاریتاً نہ منگایا ہوتا تو یہ پہلی ہاشمی لڑکی ہوتی جس کے ہاتھ میں چوری کے الزام میں قطع کراتا۔"

امیرالمؤمنین کی صاحبزادی نے عرض کی "امیرالمؤمنین میں آپ کی بیٹی ہوں، مجھ سے زیادہ اس ہار کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟" فرمایا، "اے ابن ابی طالب کی بیٹی کیا مہاجرین اور انصار کی تمام لڑکیاں عید پر ایسا ہار پہنیں گی؟" وہ خاموش ہو گئیں اور میں نے ہار ان سے لے کر بیت المال میں رکھ دیا۔

حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کے ایسے اور بھی بہت سے واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں جو ان کی عظمتِ کردار پر دال ہیں۔ سیدنا علیؓ کی ذات گرامی صرف زہد فی الدنیا ہی کا نمونہ نہیں تھی بلکہ وہ عدل و انصاف اور عمّال کا محاسبہ کرنے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ عُمّال کو ہمیشہ تقویٰ، نرمی اور عدل سے کام لینے کی تلقین فرماتے اور ان کی معمولی سی بدعنوانی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ رعایا پر نہایت شفیق تھے اور عدل و انصاف میں مطلق کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے "تاریخ الخلفاء" میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ جنگِ صفین میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوئے تو زِرہ باوجود تلاش کرنے کے نہ ملی۔ جنگ سے واپس آئے تو وہ زرہ ایک یہودی کے پاس نکلی۔ انہوں نے یہودی سے فرمایا، "نہ میں نے زرہ کسی کو دی، نہ کسی کے ہاتھ بیچی پھر یہ تیرے پاس کیسے آ گئی؟ اس نے کہا، میں کچھ نہیں جانتا یہ زرہ میرے قبضے میں ہے اور میری ہے۔ حضرت علیؓ خلیفۂ وقت تھے، چاہتے تو زرہ بزور اس سے لے سکتے تھے لیکن وہ یہ معاملہ قاضی شریح کی عدالت میں لے گئے۔ قاضی صاحب نے امیرالمؤمنین کا دعویٰ اور یہودی کا جواب سن کر حضرت والاؓ سے فرمایا، اپنے گواہ لائیے۔ انہوں نے فرمایا، میرا بیٹا حسنؓ اور غلام قنبر موجود

ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا، بیٹے کی باپ کے لیے اور غلام کی آقا کے لیے شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا تعجب ہے کہ آپ اہل جنت کی شہادت قبول نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ اہل جنت کے سردار ہیں لیکن شریح اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اس پر یہودی یکایک چلّا اٹھا، آپ خلیفۂ وقت ہیں لیکن قاضی صاحب آپ پر عام آدمیوں کی طرح جرح کر رہے ہیں۔ بے شک آپ کا دین سچا ہے اور یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کلمہ پڑھ کر حلقۂ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

۱۷ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ کو ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے عین اس وقت امیر المؤمنین پر زہر آلود تلوار سے قاتلانہ حملہ کیا جب وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ربّ العزت کے حضور سر بسجدہ تھے۔ قاتل گرفتار ہو گیا تو آپؑ نے اپنے صاحبزادوں سے فرمایا، اس کا قتل اس وقت تک ملتوی رکھو جب تک کہ میں مر نہ جاؤں۔ امام احمدؒ بن حنبل نے آپؑ سے یہ الفاظ منسوب کیے ہیں کہ اگر میں مر جاؤں تو اس کو قتل کر دینا اور اگر میں بچ گیا تو صرف زخم کا بدلہ لیا جائے گا۔ علامہ محب الدین طبری نے "الریاض النضرہ" میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا، "جان کا بدلہ جان ہے اگر میں مر گیا تو اس کو مار ڈالنا، اگر زندہ رہا تو اس کی نسبت خود فیصلہ کروں گا۔ خبردار بجز میرے قاتل کے کسی کو نہ مارنا۔ اے بنی مطّلب میں مسلمانوں کا خون نہیں کرانا چاہتا۔ اے حسن آگاہ رہو کہ میرے قاتل کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے بچو اگرچہ وہ کھٹکنا کتا ہی کیوں نہ ہو۔"

۲۰ رمضان المبارک (جمعہ) سنہ ۴۰ھ کی شب کو اسلام کا یہ مہرِ عالم افروز ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل و مناقب اور عظمتِ کردار کی تفصیل

بیان کرنے کے لیے پورا دفتر درکار ہے یہاں ہم ان کی حیاتِ طیبہ کے چند خاص پہلوؤں پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ سیّدنا حضرت علیؓ کی کفالت اور تربیت خود سید المرسلینؐ نے فرمائی اور بارگاہِ رسالت میں انہیں ہمیشہ درجۂ تقرّب و اختصاص حاصل رہا۔

۲۔ ان کو بچپن میں ہی قبولِ ایمان کی سعادت نصیب ہوئی اور انہوں نے "سابقون الاوّلون" میں بھی خاص درجہ حاصل کیا۔

۳۔ وہ زندگی کے کسی دَور میں بُت پرستی، شراب نوشی یا کسی اور قبیح حرکت میں ملوّث نہیں ہوئے۔

۴۔ انہوں نے سب سے پہلے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔

۵۔ ہر معرکے میں اپنی شجاعت و بسالت اور فدا کاری کا لوہا منوایا اور راہِ حق میں کبھی اپنی جان کی پروا نہ کی۔ بدر، اُحد، خندق، خیبر اور حنین کے بطلِ خاص ہوئے اور اسد اللہ الغالب کے لقب کے مستحق ٹھہرے۔

۶۔ مکّہ میں سالہا سال تک سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر قسم کے مصائب جھیلتے رہے۔ شبِ ہجرت حضورؐ کے بستر مبارک پر سوئے۔

۷۔ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا مواخاتی بھائی بنایا۔ چند سال بعد ان کو اپنے ساتھ وہی نسبت دی جو حضرت موسیٰؑ کو حضرت ہارونؑ سے تھی۔

۸۔ وہ اصحابِ بدر میں سے ایک ہیں جن کی تمام خطائیں اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیں۔

۹۔ وہ سابقون الاوّلون میں سے بھی ہیں اور مہاجرین سے بھی اور ان سب کو اللہ تعالیٰ نے جنّتی قرار دیا ہے۔

۱۰۔ وہ بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے اور "اصحاب الشجرہ" کی جماعت میں شامل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اپنے راضی ہونے کی خبر دی۔

۱۱۔ وہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔

۱۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا علم ہر جنگ میں ان کے پاس رہا۔

۱۳۔ خود ذاتِ رسالت مآبؐ نے انہیں ابو تراب کی کنیت عطا فرمائی۔

صحیح بخاری میں حضرت سہیلؓ بن سعد سے روایت ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہؓ کے مکان میں آئے اور علیؓ کو نہیں پایا، پوچھا تمہارے ابنِ عم کہاں ہیں۔ بولیں مجھ میں اور ان میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی، وہ غصہ میں چلے گئے ہیں اور یہاں (دوپہر کو) نہیں لیٹے۔ رسول اللہ نے ایک شخص سے فرمایا، دیکھو، وہ کہاں ہیں؟ اس نے آکر خبر دی کہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ پہلو سے چادر ہٹ گئی تھی اور مٹی جسم میں لگ گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مٹی پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے "ابو تراب (مٹی کے باپ) اٹھو ابو تراب اٹھو۔" یہ کنیت حضرت علیؓ کو اس قدر پیاری تھی کہ جب کوئی اس سے مخاطب کرتا تو بے حد خوش ہوتے۔

۱۴۔ وہ ان چار مقدس ہستیوں میں سے ایک ہیں جن پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قول کے مطابق حضورؐ نے ایک کپڑا ڈال کر دعا فرمائی:

"اللھم ھٰؤلاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیراً"

(الٰہی یہ میرے اہلِ بیت ہیں ان سے گندگی کو دور رکھ اور انہیں پاک کر دے)

اس موقع پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ میں بھی تو آپ کے

"اہلِ بیت میں سے ہوں ۔" حضورؐ نے فرمایا "تم الگ رہو۔ تم تو خیر ہو ہی۔" (صحیح مسلم، مسندِ احمد، مسندِ بیہقی، مستدرکِ حاکم وغیرہ) یہ چار نفوس حضرت علیؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تھے۔

۱۵۔ وہ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا بتولؓ کے زوج ہیں۔ ان کا نکاح خود حضورؐ نے سیدہؓ سے پڑھایا اور دونوں کو دعائے خیر و برکت دی۔

۱۶۔ وہ کاتبِ وحی تھے۔ صلحنامۂ حدیبیہ بھی انہوں نے ہی تحریر کیا۔ اس میں سے "رسول اللہ" کا لفظ محو کرنا گوارا نہ کیا۔ حضورؐ کے کئی مکاتیب و فرامین بھی انہوں نے تحریر کیے۔

۱۷۔ اُن سے بُغض رکھنے کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے محرومی کا سبب بتایا۔

۱۸۔ ان کو خود حضورؐ نے یمن کا قاضی، مبلّغ اور حاکم مقرر فرمایا۔

۱۹۔ وہ بے حد عبادت گزار تھے۔ امام حاکمؒ نے زبیر بن سعید سے روایت کی ہے کہ میں نے کسی ہاشمی کو نہیں دیکھا جو ان سے زیادہ عبادت گزار ہو۔ ترمذی کتاب المناقب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ علیؓ بڑے روزہ دار اور عبادت گزار تھے۔

۲۰۔ ان کی ذات فقر و زہد سے عبارت تھی۔ تمام عمر فقر و فاقہ میں گزاری۔ عہدِ رسالت میں ان کی زوجۂ محترمہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اپنے ہاتھوں سے چکی پیسا کرتی تھی اور حضرت علیؓ خود پانی ڈھو کر لایا کرتے تھے۔ قوتِ لایموت کے لیے مزدوری سے بھی عار نہیں کرتے تھے۔ کئی مرتبہ کھجوروں کی اُجرت پر مزدوری کی۔ لباس، خوراک، رہن سہن، ہر بات میں کمال درجے کی سادگی تھی۔

۲۱۔ بے حد سخی اور ایثار پیشہ تھے کوئی سائل اور حاجت مندان کے در سے خالی نہ جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے ایک مرتبہ رات بھر کسی کا باغ سینچتے رہے۔ صبح کے وقت تھوڑے سے جَو مزدوری میں ملے۔ وہ لے کر گھر آئے حضرت فاطمہؓ نے

ان میں سے ایک تہائی پکائے ہی تھے کہ ایک مسکین نے صدا دی۔ حضرت علیؑ نے سارا کھانا اٹھا کر اس کو دے دیا۔ حضرت فاطمہؑ نے دوسرا ثلث تیار کیا تو ایک نادار یتیم نے آکر سوال کیا۔ حضرت علیؑ نے یہ کھانا بھی اس کو دے دیا۔ حضرت فاطمہؑ نے باقی جو پکائے تو ایک قیدی دروازے پر آ گیا۔ حضرت علیؑ نے یہ بھی اس کو دے دیئے اور یوں سارا گھر فاقہ سے رہا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ سورۃ الدھر کی یہ آیت نازل ہوئی: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ (اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

۲۲۔ وہ علم و فضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔ اگرچہ حدیث "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔" بعض علماء کے نزدیک ضعیف ہے لیکن اس کے باوجود تمام علماء و محققین حضرت علیؑ کی جلالتِ علمی اور تفقہ فی الدین کے معترف ہیں۔ فی الحقیقت وہ تمام علوم دینی کا بحرِ زخار تھے اور یہ ان کی زندگی کا نہایت ہی درخشاں پہلو ہے۔ علم کی نشر و اشاعت، امامت و اجتہاد اور فضل و کمال میں وہ خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے تفقہ فی الدین اور اصابتِ رائے پر دوسرے صحابہ رشک کیا کرتے تھے۔ خود حضورؐ نے انہیں عہدۂ قضا پر مامور فرمایا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے علی ہم میں سب سے بڑے قاضی ہیں۔ کتبِ حدیث و سیر میں ان کی فقاہت اور فصلِ مقدمات کے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی دانش و حکمت عطا فرمائی تھی۔

وہ قرآنِ حکیم کے حافظ تھے اور اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شانِ نزول سے واقف تھے، گویا تفسیرِ قرآن میں وہ مرتبۂ کمال پر تھے۔ خود ان کا اپنا قول ہے "مگر وہ فہم جو خدا کسی کو قرآن میں دے وہ میرے پاس ہے۔" حدیث میں بھی وہ ارشاداتِ نبوی کے بہت بڑے عالم تھے، ان سے ۵۸۶ حدیثیں مروی

ہیں۔ تقریر و خطابت میں اپنی مثال آپ تھے۔ مختلف کتابوں میں ان کے جو خطبے ملتے ہیں انہیں پڑھ کر لامحالہ شیرِ خدا کے زورِ بیان اور تبحرِ علمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سیدنا علیؓ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ اربابِ سیر نے ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں جو حسنِ تخیل اور خوبیٔ بیان کا مظہر ہیں۔ فنِ نحو کی ایجاد کا سہرا بھی حضرت علیؓ کے سر ہے۔ یہ حضرت علیؓ کے علم و فضل کے بارے میں محض چند اشارے ہیں ورنہ

"سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے۔"
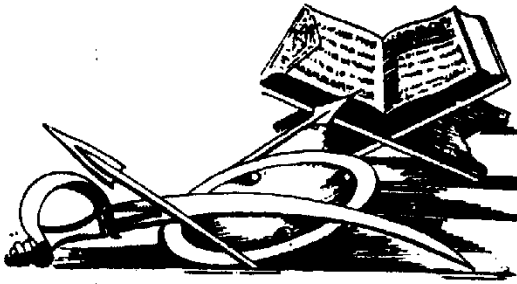
سیدۃ النساءؓ کی خوشدامن
حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد

ہجرت نبویؐ کے چار پانچ سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اندوہناک خبر سن کر سخت ملول و محزون ہو گئے اور آپؐ کی چشم ہائے مقدس سے سیل اشک رواں ہو گیا۔ یہ ایک خاتون کی وفات کی خبر تھی۔ آپؐ فوراً میت والے گھر تشریف لے گئے اور ابدی نیند سونے والی خاتون کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا :

"اے میری ماں خدا آپ پر رحم کرے۔ آپ میری ماں کے بعد ماں تھیں، آپ خود بھوکی رہتی تھیں، مگر مجھے کھلاتی تھیں، آپ کو خود لباس کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن آپ مجھے پہناتی تھیں۔"

اس کے بعد آپؐ نے غمزدہ اہلِ خانہ کو اپنی قمیص مبارک مرحمت فرمائی اور ہدایت کی کہ انہیں میری قمیص کا کفن پہنا دو۔

پھر آپؐ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ (حبّ النبیؐ) اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ (میزبانِ رسولؐ) کو حکم دیا کہ جنت البقیع میں جا کر قبر کھودیں۔ جب وہ قبر کا اوپر کا حصہ کھود چکے تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم خود نیچے اترے اور اپنے دست مبارک سے لحد کھودی اور خود ہی اس میں سے مٹی نکالی۔ جب یہ کام پورا ہو گیا تو ساقیٔ کوثرؐ لحد کے اندر لیٹ گئے اور دعا مانگی :

"الٰہی میری ماں ــــــ کی مغفرت فرما اور ان کی قبر کو وسیع کر دے"

یہ دعا مانگ کر آپؐ قبر سے باہر نکلے تو شدّتِ غم سے ریش مبارک ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ خوش بخت اور عالی مرتبہ خاتون جن سے سیّدالمرسلین خیرالخلائق فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا گہرا لگاؤ اور پیار تھا حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد تھیں۔

حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کا شمار ان جلیل القدر صحابیاتؓ میں ہوتا ہے جو اُمّتِ مسلمہ کے لیے سرمایۂ فخر و ناز ہیں۔ وہ سردارِ قریش ہاشم بن عبد مناف کی پوتی، حضرت عبدالمطّلب کی بھتیجی اور بہو۔ حضرت ابوطالب کی زوجہ، سرورِ کونینؐ کی چچی اور سمدھن، حضرت جعفر طیارؓ شہیدِ موتہ اور شیرِ خدا حضرت علی المرتضیٰؓ کی والدہ اور خاتونِ جنّت سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ بتولؓ کی خوشدامن تھیں۔

حضرت فاطمہؓ کے والد اسد بن ہاشم، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطّلب بن ہاشم کے سوتیلے بھائی تھے۔ (اسد کی والدہ کا نام قیلہ بنتِ عامر تھا اور حضرت عبدالمطّلب، سلمٰی بنتِ عمرو بن زید نجاری کے بطن سے تھے) تاریخ میں اسد بن ہاشم کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

حضرت فاطمہؓ نے قریش کے معزز ترین گھرانے بنو ہاشم میں آنکھیں کھولیں اور اسی میں پروان چڑھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے نہایت اعلیٰ اوصاف و خصائل کی مالک تھیں۔ چنانچہ حضرت عبدالمطّلب کی نگاہِ گوہر شناس نے انہیں اپنی بہو بنانے کے لیے منتخب کر لیا اور اپنے فرزند عبدِ مناف (ابوطالب) سے ان کا نکاح کر دیا۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے انہیں چار فرزند اور تین لڑکیاں عطا کیں لڑکوں

کے نام طالب، عقیلؓ، جعفرؓ اور علیؓ تھے اور لڑکیوں کے نام اُمِّ ہانیؓ (ان کا اصل نام باختلافِ روایت فاختہ، ہندیا فاطمہ تھا) جمانہ اور ربطہ تھے۔

علامہ ابنِ عبدالبرؒ نے "استیعاب" میں لکھا ہے۔ ھی اول ھاشمیہ ولدت لھاشمی (یعنی یہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جن سے ہاشمی اولاد پیدا ہوئی) کہا جاتا ہے کہ وہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھیں، چنانچہ یہ شعر ان سے منسوب ہے، جو انہوں نے اپنے فرزند عقیل کے بارے میں کہا تھا:

انت تکون ساجدٌ نبیل

اذا تہبّ شمال ببلیل

بعثت کے بعد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو بنو ہاشم نے آپؐ کا سب سے زیادہ ساتھ دیا۔ حضرت فاطمہؓ کے فرزند حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تو دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے اولین نوجوان (لڑکے) تھے۔ خود حضرت فاطمہؓ بھی ابتدائے دعوت میں سعادت اندوزِ اسلام ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد ان کے دوسرے فرزند جعفرؓ بھی پرستارانِ حق میں داخل ہو گئے۔

علامہ ابنِ اثیرؒ نے "اُسدُ الغابہ" میں لکھا ہے کہ ایک دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے ساتھ مشغولِ عبادت تھے۔ حضرت ابو طالب نے انھیں دیکھا تو حضرت جعفرؓ سے فرمایا ——— "بیٹے تم بھی اپنے ابنِ عم کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔" حضرت جعفرؓ حضورؐ کی بائیں جانب کھڑے ہو گئے، عبادت میں انہیں ایسا لطف آیا کہ حضورؐ کے دارِ ارقمؓ میں پناہ گزین ہونے سے پہلے ہی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔

حضرت ابو طالب، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ فی الحقیقت حضرت عبدالمطلب کی وفات

کے بعد حضرت ابوطالب اور ان کی اہلیہ فاطمہؓ نے جس خلوص اور دلسوزی کے ساتھ سرورِ کونین ﷺ کی سرپرستی کی اور نہایت نامساعد حالات میں بھی آپؐ کی حفاظت وحمایت میں جان کی بازی لگادی، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بعثت کے بعد جب اہلِ حق پر مشرکین قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو سرورِ عالم ﷺ نے مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵ھ بعد بعثت اور ۶ھ بعد بعثت میں مسلمانوں کے دو قافلے یکے بعد دیگرے ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر حبش چلے گئے۔ ان مہاجرین میں حضرت فاطمہؓ کے فرزند دلبند حضرت جعفرؓ بھی تھے اور ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس بھی تھیں۔

ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ حضرت جعفرؓ پہلی ہجرت حبشہ کے شرکاء میں سے تھے، لیکن موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں لکھا ہے کہ وہ دوسری ہجرت کے مہاجرین میں سے تھے۔ بہرصورت حضرت فاطمہؓ نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنے فرزند اور بہو کی جدائی برداشت کی۔

۷ھ نبوت میں مشرکین قریش نے فیصلہ کیا کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب محمد ﷺ کو قتل کے لیے ان کے حوالے نہ کریں گے کوئی شخص ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کی جائے گی اور نہ ان سے رشتہ ناتا کیا جائے گا۔ اس فیصلہ کو معرضِ تحریر میں لاکر ہر قبیلہ کے نمائندے نے دستخط کیے یا انگوٹھا لگایا اور اسے درِ کعبہ پر آویزاں کردیا۔ حضرت ابوطالب کو اس معاہدہ کا علم ہوا تو وہ ہاشم اور ان کے بھائی مطلب کی تمام اولاد و احفاد کو ساتھ لے کر شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہو گئے۔ صرف ابولہب اور اس کے زیرِ اثر چند ہاشمیوں نے مشرکین کا ساتھ دیا۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب مسلسل تین

برس تک شعبِ ابی طالب میں زہرہ گداز مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ ان محصورین میں حضرت فاطمہؓ بنت اسد بھی تھیں۔ اس دورِ ابتلا میں انھوں نے اپنے اہلِ کنبہ کے ساتھ کمال درجے کی ہمت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔

۱۰ نبوت میں حضورؐ کے چچا حضرت ابوطالب نے وفات پائی تو آپؐ کی سرپرستی کی ذمہ داری حضرت فاطمہؓ نے اٹھالی، وہ اپنے فرزندوں سے بھی بڑھ کر آپؐ پر شفیق تھیں۔

جب عام مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا تو حضرت فاطمہؓ بھی ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئیں۔ ہجرت کے موقع پر ان کے لختِ جگر حضرت علی مرتضیٰؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ پُرنور انہیں اپنے بستر پر سُلا کر سفرِ ہجرت پر روانہ ہوئے۔

ہجرتِ نبوی کے کچھ عرصہ بعد حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کے فرزندِ دلبند جناب علی مرتضیٰؓ کا نکاح رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہرا بتولؓ سے ہوا۔ اس موقع پر زوجِ بتولؓ نے اپنی والدہ ماجدہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

کفی فاطمۃ بنت رسول اللّٰہ سقایۃ الماء والذھاب فی الحاجۃ ویکفک الداخل الطحن والعجن۔

(فاطمہ بنتِ رسولؐ اللہ آتی ہیں۔ میں پانی بھروں گا اور باہر کا کام کروں گا اور وہ چکی پیسنے اور آٹا گوندھنے میں آپ کی مدد کریں گی۔)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد سے بڑی محبت تھی آپؐ اکثر ان سے ملنے کے لیے تشریف لاتے اور ان کے گھر آرام فرماتے۔ حضورؐ نے کئی بار ان کی شفقت، شرافت اور خصائلِ حمیدہ کی تحسین فرمائی۔ "درِمنثور" میں ہے:

"یہی فاطمہ ہیں جن کے فضائل و مآثر کتبِ سیر میں مذکور ہیں۔"

حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد نے ہجرت کے چند سال بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں ہی وفات پائی۔ حضورؐ نے ان کی وفات کو شدت سے محسوس کیا۔ اپنی قمیص مبارک اتار کر کفن دیا اور تدفین سے پہلے قبر میں اتر کر لیٹ گئے۔ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا:

"ابوطالب کے بعد ان سے زیادہ میرے ساتھ کسی نے مہربانی نہیں کی میں نے اپنی قمیص ان کو اس لیے پہنائی کہ جنت میں انہیں حُلّہ ملے اور قبر میں اس لیے لیٹا کہ شدائدِ قبر میں آسانی ہو۔"

ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتوں کو فاطمہؓ بنتِ اسد پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کے فرزند عقیلؓ اور صاحبزادیوں اُمِّ ہانیؓ اور جمانہؓ کو بھی قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی۔ ربطہ کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ جس خاتون کو سیدالمرسلین فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص مبارک کا کفن ملا ہو اور جس کی آخری آرام گاہ سے رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر مَس ہوا ہو، اس کے علوِّ مرتبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے!

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اولاد

سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پانچ اولادیں عطا فرمائیں۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں ان کے اسمائے گرامی (ترتیب ولادت کے مطابق) یہ ہیں۔

۱۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ

۲۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ

۳۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا

۴۔ حضرت اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا

۵۔ حضرت محسن رضی اللہ عنہ

بعض مؤرخین محسن کے وجود سے انکار کرتے ہیں لیکن مسعودی، یعقوبی، ابوالفدا وغیرہ نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ محسن صغر سنی میں فوت ہو گئے۔ مؤرخ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی تین بیٹیاں تھیں (تیسری بیٹی کا نام رقیہ بتایا گیا ہے) لیکن یہ روایت ضعیف ہے اور جمہور اہلِ سیر و تاریخ اس کی تائید نہیں کرتے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو ہر لحاظ سے مکمل بنانے کے لیے سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کی عظیم المرتبت اولاد کے وقائع زندگی بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں۔ اگلے صفحات میں یہ حالات ملاحظہ فرمایئے۔

سیّدنا حضرت حسنؓ بن علیؓ (المحسنؓ)

سیّدنا حضرت حسنؓ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے پہلے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کنیت ابو محمد ہے اور ریحانۃ النبیؐ لقب۔ بعض روایتوں میں ان کے اور القاب بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً سیّد، شبر، مجتبےٰ اور شبیہ رسول وغیرہ۔ ۱۵ رمضان (بروایت دیگر شعبان) ۳ھ ہجری کو مدینہ منورہ میں متولد ہوئے۔ حضرت علیؓ نے حرب نام رکھا تھا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر حسن رکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی کنیت ابو محمد بھی حضورؐ نے تجویز فرمائی تھی (حضرت حسنؓ نے بڑے ہو کر اپنے کسی فرزند کا نام محمد نہیں رکھا) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسنؓ کی ولادت پر بہت مسرت ہوئی۔ ان کے کان میں اذان دی اور اپنا لعاب دہن چٹایا۔ پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا۔ دو مینڈھے ذبح کرائے اور نومولود کے سر کے بال اتروا کر ان کے ہم وزن چاندی صدقہ دی۔

سیّدنا حضرت حسنؓ نے تقریباً آٹھ سال تک رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ حضورؐ اپنے تمام نواسوں نواسیوں سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ آپؐ کی محبت اور شفقت کے کچھ واقعات ایک الگ باب میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تھے اور حسنؓ آپؐ کے پہلو

میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ ایک مرتبہ لوگوں کی طرف دیکھتے تھے اور ایک مرتبہ حسنؓ کی طرف۔ (اسی حال میں) فرمایا، یہ میرا بیٹا سیّد (سردار) ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔"

حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے وہ بھی ذاتِ رسالت مآبؐ کے تعلق کی وجہ سے حضرت حسنؓ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ دونوں عصر کی نماز پڑھ کر اکٹھے مسجد سے نکلے۔ راستے میں حضرت حسنؓ کھیل رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بڑی محبت وشفقت کے ساتھ ان کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھالیا اور فرمایا:

"خدا کی قسم یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے علی کے مشابہ نہیں۔"

حضرت علیؓ یہ سن کر ہنسنے لگے۔

سیّدنا حضرت عمر فاروقؓ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو انہوں نے بھی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ ایسا ہی محبت آمیز برتاؤ رکھا۔ انہوں نے بیت المال قائم کیا اور مسلمانوں کے علیٰ قدرِ مراتب سالانہ وظائف مقرر کیے تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے وظیفے اصحابِ بدر کے وظیفوں کے برابر مقرر کیے (پانچ ہزار درہم سالانہ) خود امیر المومنینؓ اور حضرت علیؓ کا بھی اتنا ہی وظیفہ تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کے نزدیک حسنینؓ کی کیا قدر ومنزلت تھی۔

سیّدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے دورِ خلافت کا آغاز ہوا تو حضرت حسنؓ پورے جوان ہوچکے تھے۔ شیخینؓ کی طرح حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا سلوک

بھی حضرت حسنؓ کے ساتھ نہایت شفقانہ اور محبت آمیز تھا۔ سنہ ۲۹ یا ۳۰ ہجری میں حضرت عثمانؓ کے حکم سے حضرت سعیدؓ بن العاص نے طبرستان پر لشکر کشی کی تو حضرت حسنؓ بھی دوسرے نوجوانانِ قریش کے ساتھ اسلامی لشکر میں شریک ہو گئے اور کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے آخر میں شورش برپا ہوئی اور باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کو کاشانۂ خلافت کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ کچھ اور جوانانِ قریش بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت حسنؓ مدافعت کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تاہم انھوں نے کسی باغی کو کاشانۂ خلافت میں داخل نہ ہونے دیا۔ بالآخر باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کو اس حالت میں شہید کر دیا، جب وہ قرآنِ پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کو شہادت کی خبر ہوئی تو انھوں نے جوشِ غضب میں حضرت حسنؓ کو تھپڑ مارا کہ تم نے کیسی حفاظت کی کہ باغیوں نے اندر گھس کر عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔ جب انھوں نے صورتِ حال کی وضاحت کی اور اپنے زخم دکھائے تو حضرت علیؓ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے حضرت علیؓ سے قبولِ خلافت کے لیے اصرار کیا اس موقع پر حضرت حسنؓ نے والدِ بزرگوار کو مشورہ دیا کہ جب تک تمام ممالکِ اسلامیہ کے لوگ آپ سے مسند نشینِ خلافت ہونے کی درخواست نہ کریں آپ کسی سے امرِ خلافت پر بیعت نہ لیجیے۔ لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خلیفہ کا انتخاب مہاجرین اور انصار کا حق ہے۔ جب وہ کسی کو خلیفہ تسلیم کر لیں تو دوسرے تمام مسلمانوں پر اس کی اطاعت واجب ہو

جاتی ہے۔ بیعت کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں کے مشورہ کی شرط نہیں۔ چنانچہ انہوں نے خلافت قبول کر لی۔

حضرت علیؓ کے مسند نشین خلافت ہونے کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اصلاح کا علَم بلند کیا اور حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ اسی سلسلے میں جنگ جمل پیش آئی۔ جنگ سے پہلے حضرت حسنؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کوفے گئے اور وہاں کے لوگوں کو اپنی حمایت پر ابھارا۔ ان کی مساعی کے نتیجہ میں تقریباً دس ہزار اہل کوفہ حضرت علیؓ کے لشکر میں آ شامل ہوئے۔ جمل کے بعد ۳۷ھ میں جنگ صفین پیش آئی اس میں بھی حضرت حسنؓ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تھے۔ التوائے جنگ کے لیے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جو معاہدہ ہوا حضرت حسنؓ نے ایک گواہ کی حیثیت سے اس پر دستخط کیے۔

رمضان ۴۰ھ میں ایک خارجی ابن ملجم نے حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ زخمی ہونے کے بعد وہ تین دن زندہ رہے۔ اس اثنا میں ان سے حضرت حسنؓ کی جانشینی کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"نہ میں حکم دیتا ہوں نہ روکتا ہوں۔"

تیسرے دن حضرت علیؓ واصل بحق ہو گئے۔ ان کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد کوفے کی مسجد جامع میں حضرت حسنؓ کے لیے بیعت خلافت ہوئی۔ بعض روایتوں کے مطابق بیس ہزار سے زیادہ لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت امیر معاویہؓ والیٔ شام نے ان کی خلافت کو تسلیم نہ کیا اور عراق کی طرف فوجی پیشقدمی شروع کر دی۔ ان کے مقدمۃ الجیش کے افسر حضرت عبداللہؓ بن عامر انبار ہوتے ہوئے مدائن کی طرف بڑھے۔ حضرت حسنؓ اس وقت

کوفہ میں تھے انہیں عبداللہؓ بن عامر کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو وہ بھی اہل عراق کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لیے مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ ساباط پہنچ کر انہوں نے اپنی فوج میں کمزوری اور جنگ سے پہلوتہی کے آثار دیکھے تو اس کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"لوگو! میں کسی مسلمان کے خلاف اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور تمہارے لیے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں اُمید ہے تم اسے رَدّ نہ کرو گے۔ جس اتحاد اور یگانگت کو تم ناپسند کرتے ہو وہ اس تشتت و افتراق سے بہتر ہے جو تم کو پسند ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر لوگ جنگ سے گریز کرنا چاہتے ہیں میں تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف لڑنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا۔"

حضرت حسنؓ کی تقریر سن کر وہ لوگ جو امیر معاویہؓ کے شدید مخالف تھے اور ان سے لڑنا فرض عین سمجھتے تھے، برہم ہو گئے۔ انہوں نے سیّدنا حسنؓ کی تحقیر کی اور انہیں گھیر لیا۔ ربیعہ اور ہمدان کے قبیلوں نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور حضرت حسنؓ گھوڑے پر سوار ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک خارجی جراح بن قبیصہ نے گھات لگا کر ان پر حملہ کیا اور زانوئے مبارک زخمی کر دیا۔ عبداللہ بن خطل اور عبداللہ بن ظبیان نے جراح بن قبیصہ کو پکڑ کر قتل کر ڈالا اور حضرت حسنؓ نے مدائن پہنچ کر قصر ابیض میں قیام کیا۔ جب زخم مندمل ہو گیا تو وہ پھر عبداللہؓ بن عامر کے مقابلہ کے لیے مدائن سے نکلے۔ اس اثناء میں امیر معاویہؓ بھی ایک فوج گراں کے ساتھ انبار پہنچ گئے۔ حضرت عبداللہؓ بن عامر نے حضرت حسنؓ کو پیغام بھیجا جس میں ان کو قسم دے کر جنگ ملتوی کرنے

کے لیے کہا۔ حضرت حسنؓ کے ساتھیوں نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا۔ اس پر حضرت حسنؓ پھر مدائن لوٹ گئے۔ عبداللہؓ بن عامر نے فوراً مدائن کے گرد اپنی فوج پھیلا دی۔ حضرت حسنؓ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی کمزوری اور بزدلی سے دل برداشتہ تھے انہوں نے جنگ کا خیال ترک کر دیا اور چند شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری کا فیصلہ کرلیا۔ یہ شرائط انہوں نے عبداللہؓ بن عامر کی وساطت سے امیر معاویہؓ کو بھجوا دیں۔ (الاخبار الطوال۔ ابوحنیفہ دینوری)

حافظ ابن عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ سیدنا حضرت حسنؓ نے حالات کے رُخ سے اندازہ کر لیا تھا کہ فریقین میں سے کسی ایک کی شکست اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مکمل طور پر تباہ و برباد نہ ہو جائے۔ چونکہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی ان کو پسند نہ تھی اس لیے انہوں نے صلح ہی میں بہتری سمجھی اور اس سلسلہ میں امیر معاویہؓ کو ایک خط بھیجا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ابن سعدؒ کے حوالے سے "الاصابہ" میں بیان کیا ہے کہ حضرت حسنؓ نے عمرو بن سلمۃ الارحبی کو صلح کی غرض سے امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا۔ امیر معاویہؓ نے حضرت عبداللہؓ بن عامر اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کو حضرت حسنؓ کے پاس بھیجا۔ ان دونوں نے حضرت حسنؓ کی شرائط مان لیں۔ اس طرح فریقین میں صلح ہو گئی۔ پھر حضرت امیر معاویہؓ اور سیدنا حضرت حسنؓ ساتھ ساتھ کوفے میں داخل ہوئے۔

صحیح بخاری میں یہ واقعہ کسی قدر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"حضرت حسنؓ کی فوج پہاڑوں کے مانند امیر معاویہؓ کے لشکر کی طرف بڑھی تو حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ سے کہا:

ـــــــ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ایسا لشکر ہے جو اس وقت تک پیٹھ نہ پھیرے گا جب تک اپنے اقران کو قتل نہ کر لے گا۔

حضرت معاویہؓ نے کہا، اگر یہ لوگ انہیں اور وہ انہیں قتل کر دیں تو میری طرف سے لوگوں کے معاملات کا نیز ان کی عورتوں اور بچوں کا ذمہ دار کون ہو گا؟

اس وقت انہوں نے عبداللہؓ بن عامر اور عبدالرحمنؓ بن سمرہ کو حضرت حسنؑ سے گفت و شنید کے لیے بھیجا۔"

ابو حنیفہ دینوری نے "الاخبار الطوال" میں لکھا ہے کہ حضرت حسنؑ ان شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے:

۱۔ سب لوگوں کو بلا استثنا امان دی جائے گی اور کوئی عراقی محض بغض و کینہ کی بنا پر نہ پکڑا جائے گا۔

۲۔ صوبہ اہواز کا کل خراج حضرت حسنؑ کے لیے مخصوص ہو گا اور حضرت حسینؑ کو دو لاکھ درہم سالانہ الگ دیئے جائیں گے۔

۳۔ صلات اور عطیات میں بنو ہاشم کو بنو امیہ پر ترجیح دی جائے گی۔

حضرت حسنؑ نے یہ شرطیں لکھ کر حضرت عبداللہؓ بن عامر کو دیں۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے پاس بھیج دیں۔ امیر معاویہؓ نے تمام شرطوں کی منظوری کا خط لکھ کر اپنی مہر لگائی اور معززین و عمائد کی شہادتیں لکھوا کر کاغذ حضرت حسنؑ کے پاس واپس بھیج دیا ـــــ اس طرح ملت اسلامیہ کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا اور تمام مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے بجائے امیر معاویہؓ کی خلافت پر متفق ہو گئے۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ سیدنا حضرت حسنؑ نے کوفہ کی جامع مسجد میں مجمع عام کے سامنے اپنی دست برداری کا اعلان ان الفاظ

میں کیا:

"لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اگلوں کے ذریعے سے تم کو ہدایت دی اور پچھلوں کے ذریعے تمہاری خونریزی بند کرائی۔ دانائیوں میں بہترین دانائی تقویٰ اور عجز میں سب سے بڑا عجز فجور (بداعمالی) ہے اور یہ امر (خلافت) جو ہمارے اور معاویہؓ کے درمیان متنازعہ ہے یا تو وہ اس کے مجھ سے زیادہ حقدار ہیں یا یہ میرا حق ہے جس سے میں اللہ عزّ و جلّ کی خوشنودی، اُمّتِ محمدیہ کی اصلاح اور تم لوگوں کو خونریزی سے بچانے کی خاطر دستبردار ہوتا ہوں۔"

اس کے بعد سیّدنا حضرت حسنؓ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینہ منوّرہ چلے گئے۔ اس طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

"میرا یہ بیٹا سیّد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔"

سیّدنا حضرت حسنؓ کی مدّتِ خلافت کے بارے میں روایتوں میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں میں چار ماہ اور بعض میں آٹھ ماہ سے کچھ اوپر بتائی گئی ہے۔ "دائرۂ معارفِ اسلامیہ" کے مطابق صحیح یہ ہے کہ ان کا زمانۂ خلافت ۲۰ رمضان ۴۰ھ سے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۴۱ھ تک ہے۔ گویا وہ سات ماہ ۲۶ دن تک مسندنشینِ خلافت رہے۔

دستبرداری کے بعد سیّدنا حضرت حسنؓ نے اپنی وفات تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا اور نہایت خاموشی سے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں زندگی گزاری۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ ایک

دفعہ حضرت معاویہؓ نے مدینہ منوّرہ کے کسی شخص سے حضرت حسنؓ کے حالات دریافت کیے تو اس نے کہا :

"فجر کی نماز سے طلوعِ آفتاب تک مصلّے پر رہتے ہیں پھر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ملاقات کے لیے آنے والوں سے ملتے ہیں۔ دن چڑھے چاشت کی نماز ادا کر کے اُمّہاتُ المؤمنینؓ کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ (ابنِ عساکر)

مکّہ معظمہ میں ہوتے تو عصر کی نماز بالالتزام حرم پاک میں ادا کرتے اور پھر طواف میں مشغول ہو جاتے۔

فکرِ معاش کی طرف سے بے نیاز تھے کیونکہ اہواز کا سالانہ خراج ان کے لیے مخصوص تھا۔ امام شعبیؒ کا بیان ہے کہ اس خراج کی رقم دس لاکھ درہم سالانہ تھی۔ اس کثیر آمدنی کو وہ بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے دو مرتبہ اپنا تمام مال اسباب اور تین مرتبہ کل مال اسباب کا نصف راہِ خدا میں بانٹ دیا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ چلا جائے۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنا ان کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ طواف میں مشغول تھے کہ کسی شخص نے اپنی ضرورت کے لیے ساتھ لے جانا چاہا۔ طواف چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو گئے اور واپس آکر طواف پورا کیا۔ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے کہ کوئی سائل آ گیا۔ انہوں نے اعتکاف کے دائرے سے نکل کر اس کی ضرورت پوری کی اور پھر اعتکاف میں بیٹھ گئے۔

سیدنا حضرت حسنؓ نے باختلافِ روایت ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں اپنی والدہ ماجدہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے پہلو میں

دفن ہوئے۔

اکثر اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ سیدنا حضرت حسنؓ کی وفات زہر سے ہوئی جو ان کی ایک بیوی جعدہ بنت اشعث نے (کسی وجہ سے) دیا۔

حافظ ابن عبدالبرؒ اور المسعودی کا بیان ہے کہ حضرت حسنؓ کو کئی بار زہر دیا گیا لیکن جو زہر آخری بار دیا گیا وہی فیصلہ کن ثابت ہوا۔ بعض روایتوں کے مطابق زہر کھانے کے تیسرے دن اور بعض کے مطابق چالیس دن علیل رہنے کے بعد وفات پائی۔ حافظ ابن حجرؒ اور ابو حنیفہ دینوری نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت حسنؓ کی موت زہر سے نہیں بلکہ کسی اور علالت سے ہوئی۔

(الاصابہ —— الاخبار الطوال)

سیدنا حضرت حسنؓ کی رحلت کی خبر پھیلی تو ہر طرف کہرام برپا ہو گیا۔ مدینہ منورہ کے بازار بند ہو گئے، اور ہر شخص فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا۔ حضرت ابوہریرہؓ مسجد نبوی میں رو رو کر کہتے تھے —— "لوگو آج خوب رو لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب دنیا سے اٹھ گیا۔"

جنازہ میں اس قدر ہجوم تھا کہ اس سے پہلے مدینہ منورہ میں بہت کم دیکھنے میں آیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق جنازہ میں لوگوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ اگر سوئی بھی پھینکی جاتی تو زمین پر نہ گرتی۔

سیدنا حضرت حسنؓ نے اپنی زندگی میں بہت سے نکاح کیے۔ مختلف بیویوں سے آٹھ لڑکے پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں:

الحسن، زید، عمر، قاسم، ابوبکر، عبدالرحمٰن، طلحہ، عبیداللہ

سیدنا حضرت حسنؓ جس خانوادے میں پلے بڑھے وہ علم و فضل کا سرچشمہ

تھا۔ اس لیے فضل و کمال کے لحاظ سے وہ بھی نہایت بلند مقام پر فائز ہو گئے۔ ان کا شمار مدینہ منورہ کے ان اصحاب میں ہوتا تھا جو علم و افتاء کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے چند فتاویٰ بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

سیدنا حضرت حسنؓ عہدِ نبوی میں کمسن تھے۔ تاہم روایتِ حدیث سے اُن کا دامن خالی نہیں رہا۔ ان سے تیرہ احادیث مروی ہیں۔ دینی علوم کے علاوہ وہ اس زمانہ کے مروجہ فنون میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اونچے درجے کے خطیب تھے اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔

شکل و شمائل میں سیدنا حضرت حسنؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ تھے۔ سیرت بھی نہایت پاکیزہ تھی۔ ان کے گلشنِ اخلاق میں زہد و استغنا، حلم و تحمل، جود و سخا، خوش خلقی، امن پسندی، صلح جوئی، نرم خوئی اور خیر خواہئ اُمت نہایت خوش رنگ پھول ہیں۔ دوسرے فضائل اخلاق کے ساتھ نہایت عاقل و دانا بھی تھے۔ اہلِ سیر نے ان کے بہت سے حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مکارمِ اخلاق دس ہیں:

(۱) زبان کی سچائی (۲) حُسنِ خُلق (۳) صلہ رحمی

(۴) مہمان نوازی (۵) حق دار کی حق شناسی

(۶) جنگ کے وقت حملہ کی شدّت

(۷) سائل کو دینا (۸) احسان کا بدلہ دینا

(۹) پڑوسی کی حفاظت و حمایت (۱۰) شرم و حیا۔

۲۔ سب سے اچھی زندگی وہ بسر کرتا ہے جو اپنی زندگی میں دوسروں

کو بھی شریک کرے اور سب سے بُری زندگی اس کی ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا زندگی نہ بسر کر سکے۔

۳۔ ضرورت کا پورا نہ ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس کے لیے کسی نا اہل کی طرف رجوع کیا جائے۔

۴۔ ایک شخص نے کہا کہ مجھ کو موت سے بہت ڈر معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا، اس لیے کہ تم نے اپنا مال پیچھے چھوڑ دیا اگر اس کو آگے بھیج دیا ہوتا تو اس تک پہنچنے کے لیے خوفزدہ ہونے کے بجائے مسرور رہتے۔

۵۔ مروۃ یہ ہے کہ انسان اپنے مذہب کی اصلاح کرے، اپنے مال کی دیکھ بھال اور نگرانی کرے، اسے برمحل صرف کرے، سلام زیادہ کرے، لوگوں میں محبوبیت حاصل کرے۔ کرم یہ ہے کہ مانگنے سے پہلے دے۔ احسان و سلوک کرے، برمحل کھلائے پلائے۔ بہادری یہ ہے کہ پڑوسی کی طرف سے مدافعت کرے، آڑے وقتوں میں اس کی حمایت و امداد کرے اور مصیبت کے وقت صبر کرے۔

۶۔ ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ حکومت میں ہم پر کیا فرائض ہیں۔ فرمایا جو سلیمانؑ بن داؤدؑ نے بتائے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے کہا، انہوں نے کیا بتایا ہے۔ فرمایا، انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو بتایا کہ بادشاہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں اللہ کا خوف کرے۔ غصہ اور خوشی دونوں میں عدل و انصاف کرے، فقر اور تموّل میں درمیانی چال رکھے، زبردستی کسی کا مال نہ غصب کرے اور نہ اس کو بے جا صرف کرے۔ جب تک وہ ان باتوں پر عمل کرتا رہے گا اس وقت تک اس کو دنیا میں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

سیّدنا حضرت حسینؓ بن علیؓ

(الحسینؓ شہیدِ کربلا)

سیّدنا حضرت حسینؓ۔ حضرت علیؓ اور سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ اور سیّد، شہید، شبیّر، سبطِ اصغر، اور ریحانۃ النبی القاب ہیں۔ ۳ یا ۴ یا ۵ شعبان سنہ ۴ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادتِ باسعادت کی خبر سُن کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور نومولود بچّے کے کانوں میں اذان دی۔ پھر آپؐ نے سیّدہ فاطمہؓ کو عقیقہ کرنے اور بچّے کے بالوں کے ہموزن چاندی خیرات کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔ والدین نے بچّے کا نام حرب رکھا تھا لیکن حضورؐ نے بدل کر حسین نام رکھا۔

سیّدنا حضرت حسینؓ نے تقریباً سات سال تک سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ دوسرے نواسوں نواسیوں کی طرح حضورؐ حضرت حسینؓ سے بھی غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ حضورؐ کی ان کے ساتھ محبت و شفقت کے واقعات ایک الگ باب میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفۃ الرسول سیّدنا حضرت ابوبکر صدّیقؓ اور امیر المؤمنین سیّدنا حضرت عمر فاروقؓ بھی حضرت حسینؓ کو ہمیشہ نہایت عزیز جانتے رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بدری صحابہؓ کے لڑکوں

کے وظیفے مقرر کیے تو جہاں دوسرے اصحاب بدر کے لڑکوں کا دو دو ہزار وظیفہ مقرر کیا وہاں حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے فرزندوں حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کا پانچ پانچ ہزار وظیفہ مقرر کیا جو خود اصحاب بدر (بشمول حضرت علیؑ) کے وظیفہ کے برابر تھا۔ فاروق اعظمؓ نے انہیں دوسرے لڑکوں پر اس وجہ سے ترجیح دی کہ وہ ان کے آقا و مولا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب نواسے تھے۔

ایک مرتبہ یمن سے بہت سے حُلّے آئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو صحابہؓ میں تقسیم کر دیا۔ اتفاق سے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے حصے میں کوئی حُلّہ نہ آیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اور حاکم یمن کو حکم بھیجا کہ فوراً دو حُلّے اور بھیجو۔ جب تک یہ حُلّے آ نہ گئے اور حسنینؑ نے پہن نہ لیے حضرت عمر فاروقؓ بے چین رہے۔ (بلاذری)

ایک اور روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے پہلے حُلّوں کو حسنینؑ کے لائق نہ سمجھا اور حاکم یمن کو فرمان بھیجا کہ دو نئے عمدہ قسم کے حُلّے بھیجو۔ یہ حُلّے آئے تو امیر المومنین نے حسنینؑ کو پہنائے اور بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ (ابن عساکر)

حضرت حسینؑ کبھی کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ طفلانہ شوخی کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ امیر المومنینؓ ان باتوں کو برداشت کرتے تھے اور حضرت حسینؑ سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔

سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد خلافت میں طبرستان پر فوج کشی ہوئی (سنہ ۳۰ھ) تو سیدنا حضرت حسینؑ اپنے برادر بزرگ حضرت حسنؑ کے ساتھ اس میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی خلافت کے آخری سال باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کیا تو حضرت علیؑ نے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ دونوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا۔ انہوں نے

بعض دوسرے اصحاب کے ساتھ مل کر باغیوں کو کاشانۂ خلافت کے اندر گھسنے سے روکے رکھا لیکن باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور امیر المومنین سیدنا حضرت عثمانؓ کو نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے دونوں بھائیوں سے باز پرس کی کہ تمہارے ہوتے ہوئے باغی کیسے اندر گھس گئے۔ انہوں نے جب واقعہ بیان کیا تو حضرت علیؓ ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو گئے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں حضرت حسینؓ نے جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں اپنے پدرِ گرامی کی طرف سے پُر زور حصہ لیا۔ جنگِ صفین کے التوا کے سلسلے میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس پر حضرت حسینؓ نے بھی اپنی گواہی ثبت کی۔ اس کے بعد انہوں نے نہروان میں خوارج کے خلاف دادِ شجاعت دی اور ان کی سرکوبی میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

سنہ ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ چند ماہ بعد انہوں نے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری کا ارادہ ظاہر کیا تو حضرت حسینؓ نے اس کی پُر زور مخالفت کی لیکن وہ حضرت حسنؓ کو اپنا ارادہ پورا کرنے سے روکنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں قسطنطنیہ پر لشکر کشی ہوئی (سنہ ۴۹ھ) تو حضرت حسینؓ نے اس میں مجاہدانہ شرکت کی۔ اسی زمانے میں انہیں اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسنؓ کی دائمی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

امیر معاویہؓ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے یزید کو ولی عہد بنایا اور اہلِ مدینہ سے یزید کی بیعت لینی چاہی تو حضرت حسینؓ اور کچھ دوسرے

اصحاب یزید کی بیعت پر آمادہ نہ ہوئے۔ تاہم امیر معاویہؓ نے ان سے چنداں تعرض نہ کیا۔ انہوں نے سنہ ۶۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے یزید کو حضرت حسینؓ کے بارے میں یہ وصیت کی :-

"میرے بعد اہل عراق حسین کو تمہارے مقابلہ میں ضرور لائیں گے۔ جب وہ تمہارے مقابلہ میں کھڑے ہوں اور تم کو ان پر قابو حاصل ہو جائے تو درگزر سے کام لینا کیونکہ وہ قرابت دار، بڑے حقدار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عزیز ہیں۔

(طبری و الفخری)

یزید تخت حکومت پر بیٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ جب تک سیدنا حضرت حسینؓ اور سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسی اہم اور صاحب اثر شخصیتیں اس کی بیعت نہیں کریں گی اس کی حکومت خطرے میں رہے گی۔ چنانچہ اس نے حاکم مدینہ ولید بن عتبہ کو حکم بھیجا کہ ان دونوں بزرگوں سے میری بیعت لو۔ یہ دونوں بزرگ اس وقت مدینہ میں مقیم تھے۔ ولید نے انہیں یزید کی بیعت کی ترغیب دی تو انہوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کی مہلت مانگی۔ ولید نے مہلت دے دی۔ اس دوران میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور سیدنا حضرت حسینؓ اپنے اہل وعیال سمیت نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ سے اہل کوفہ حضرت حسینؓ کو خط پر خط لکھ رہے تھے کہ آپ کوفہ تشریف لائیں تو ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ سیدنا حسینؓ مکہ پہنچے تو اہل کوفہ نے انہیں اپنے ہاں بلانے کے لیے خطوں کا تار باندھ دیا۔ حضرت حسینؓ نے تحقیق احوال

کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ بھیجا۔ وہاں ہزاروں آدمیوں نے مسلمؑ کے ہاتھ پر سیدنا حسینؓ کی بیعت کر لی۔ مسلم بن عقیلؑ نے تمام کیفیت حضرت حسینؓ کو لکھ بھیجی۔ ان کا خط ملنے پر سیدنا حسینؓ اپنے اہل وعیال اور جاں نثاروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکّہ سے عازم کوفہ ہو گئے۔

دوسری طرف یزید کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے عبیداللہ بن زیاد والی بصرہ کو حکم بھیجا کہ بصرہ کے ساتھ تم کوفہ کی امارت بھی سنبھالو اور خود کوفہ جا کر وہاں کے لوگوں سے میری بیعت لو۔ ابن زیاد نے کوفہ پہنچ کر بڑی سختی سے کام لیا۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ کو گرفتار کر کے شہید کرا دیا اور اہل کوفہ سے بزور یزید کی بیعت لے لی۔ سیدنا حسینؓ راستے ہی میں تھے کہ انہیں مسلم بن عقیلؑ کی شہادت اور کوفیوں کی غداری کی اطلاع ملی لیکن انہوں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔ حضرت حسینؓ اپنے اہل وعیال اور ساٹھ ستر جاں نثاروں کے ساتھ ارضِ نینوا میں پہنچے تو ۲ محرم ۶۱ھ کو کربلا کے مقام پر ابن زیاد کے بھیجے ہوئے شامی لشکر نے انہیں گھیر لیا۔ ۷ محرم کو شامی فوج نے دریائے فرات پر پہرے بٹھا دیئے تاکہ سیدنا حسینؓ اور ان کے رفقاء دریا سے پانی نہ لے سکیں۔

۱۰ محرم ۶۱ ہجری کو کربلا کا دلدوز سانحہ پیش آیا جس میں سیدنا حسینؓ نے اپنے فرزندوں، بھتیجوں اور بعض دوسرے عزیزوں اور جاں نثاروں کے ساتھ شامی لشکر کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ سانحہ کربلا کے کچھ واقعات ہم نے اختصار کے ساتھ حضرت زینبؓ بنتِ علیؓ کے حالات میں بیان کر دیئے ہیں۔

سیدنا حضرت حسینؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں جن سے متعدد اولادیں ہوئیں۔ اولادِ نرینہ میں سے صرف ایک علیؓ بن الحسینؓ (جو زین العابدین کے لقب سے مشہور ہیں) باقی بچے اور انہیں سے نسل چلی۔ ایک نوجوان فرزند علی اکبرؓ اور ایک شیر خوار صاحبزادے علی اصغرؓ واقعۂ کربلا میں شہید ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک اور فرزند عبداللہ بن حسینؓ نے بھی کربلا میں شہادت پائی۔ صاحبزادیوں کی تعداد اکثر اہلِ سیر نے تین بتائی ہے۔ سکینہؓ، فاطمہؓ اور زینبؓ۔

سیدنا حضرت حسینؓ نے خانوادۂ نبویؐ میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے معدنِ فضل و کمال بن گئے تھے۔ چونکہ عہدِ رسالت میں کمسن تھے اس لیے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سنی ہوئی مرویات کی تعداد صرف آٹھ ہے۔ البتہ بالواسطہ روایات کی تعداد کافی ہے۔ حضورؐ کے علاوہ انہوں نے جن بزرگوں سے احادیث روایت کی ہیں ان میں حضرت علیؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے رواۃِ حدیث میں برادرِ بزرگ حضرت حسنؓ، صاحبزادے حضرت علی زین العابدینؒ، صاحبزادیاں حضرت سکینہؓ و حضرت فاطمہؓ، پوتے حضرت محمد باقرؒ، شعبیؒ، عکرمہؒ، سنانؒ بن ابی سنان، عبداللہؒ بن عمرو بن عثمانؓ، فرزدق شاعر وغیرہ شامل ہیں۔

تمام اربابِ سیر نے سیدنا حضرت حسینؓ کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بڑے فاضل تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ قضا و افتاء میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ سیدنا حضرت حسینؓ نے ان کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی تھی اس لیے وہ بھی مسندِ افتاء پر فائز ہو گئے تھے اور اکابرِ مدینہ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

نے ان سے پوچھا کہ قیدی کو رہا کرانے کا فرض کس پر عائد ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا، ان لوگوں پر جن کی حمایت میں وہ لڑا ہو۔ ایک اور موقع پر ابن زبیرؓ نے ان سے استفسار کیا کہ شیر خوار بچہ کا وظیفہ کب واجب ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا پیدائش کے فوراً بعد جب بچے کے منہ سے آواز نکلتی ہے اس کا وظیفہ واجب ہو جاتا ہے۔

سیدنا حضرت حسینؓ دینی علوم کے علاوہ اس عہد کے عرب کے مروجہ علوم میں بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ ان کے تبحر علمی، علم و حکمت اور فصاحت و بلاغت کا اندازہ ان کے خطبات سے کیا جا سکتا ہے جن میں سے کچھ آج بھی کتب سیر میں محفوظ ہیں۔

فضائل اخلاق کے اعتبار سے سیدنا حضرت حسینؓ پیکر محاسن تھے۔ عبادت و ریاضت ان کا معمول تھا۔ قائم اللیل اور دائم الصوم تھے۔ فرض نمازوں کے علاوہ بکثرت نوافل پڑھتے تھے۔ ان کے فرزند حضرت علی زین العابدینؒ کا بیان ہے کہ وہ شب و روز میں ایک ایک ہزار نمازیں (نوافل) پڑھ ڈالتے تھے۔ روزے بکثرت رکھتے تھے اور سادہ غذا سے افطار فرماتے تھے۔ رمضان المبارک میں کم از کم ایک مرتبہ قرآن پاک ضرور ختم کرتے۔ حج بھی بکثرت کرتے تھے اور وہ بھی بالعموم پا پیادہ۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے پچیس حج پا پیادہ کیے۔

(تہذیب الاسماء۔ امام نوویؒ)

سیدنا حضرت حسینؓ مالی حیثیت سے نہایت آسودہ حال تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں ۵ ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا جو انہیں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے زمانہ تک برابر ملتا رہا۔ سیدنا حضرت حسنؓ نے خلافت سے دست برداری کے وقت امیر معاویہؓ سے ان کے لیے دو لاکھ سالانہ

مقرر کرا دیئے تھے۔ اس مرفہ الحالی کے باوجود ان کی زندگی پر فقر و زہد کا اثر نمایاں تھا۔ اپنا مال کثرت سے راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ بعض مرتبہ غربا کے گھروں پر خود کھانا پہنچاتے تھے۔ اگر کسی قرضدار کی سقیم حالت کا پتہ چلتا تو خود اس کا قرض ادا کر دیتے تھے۔

ایک دفعہ نماز میں مشغول تھے کہ گلی میں ایک سائل کی آواز کانوں میں پڑی۔ جلدی جلدی نماز ختم کر کے باہر نکلے۔ صدا دینے والے سائل کی خستہ حالی دیکھی تو اپنے خادم قنبر کو آواز دی، وہ حاضر ہوئے تو پوچھا، ہمارے اخراجات میں سے کچھ باقی رہ گیا ہے؟ قنبر نے جواب دیا، آپ نے دو سو درہم اہلِ بیت میں تقسیم کرنے کے لیے دیئے تھے وہ ابھی تقسیم نہیں کیے گئے ہیں فرمایا یہ ساری رقم لے آؤ اہلِ بیت سے زیادہ ایک مستحق آگیا ہے۔ قنبر نے دو سو درہم لا کر پیش کیے تو سب کے سب سائل کو دے دیئے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ اس وقت میرا ہاتھ خالی ہے اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکا۔

صدقات و خیرات کے علاوہ اہلِ علم اور شعرار کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور ان کو انعام کے طور پر بڑی بڑی رقموں سے نوازتے رہتے تھے۔

سیدنا حسینؓ کی مجالس وقار اور متانت کا مرقع ہوتی تھیں۔ لوگ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے اور ان کے سامنے ایسے سکون اور خاموشی سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ اس وقار متانت اور بلندی مرتبت کے باوجود سیدنا حسین تمکنت اور خود پسندی سے کوسوں دور تھے اور بے حد حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے نہایت کم حیثیت کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی طرف جا رہے تھے، راستے میں کچھ فقرا کھانا کھا رہے تھے۔ انھوں نے حضرت حسینؓ کو دیکھ کر اپنے ساتھ کھانے

کی دعوت دی۔ آپ سواری سے اتر پڑے اور فرمایا:

ان اللّٰہ لا یحب المتکبّرین "

(بیشک اللہ تعالیٰ تکبّر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ فارغ ہوئے تو ان سب کو دعوت پہ بلایا۔ جب وہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ نے گھر والوں کو حکم دیا، جو کچھ ذخیرہ ہے وہ سب بھجوادو۔

ارباب سِیَر نے سیّدنا حضرت حسینؓ کے بہت سے کلماتِ طیّبات نقل کیے ہیں جو دانش و حکمت اور پند و موعظت کا خزینہ ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ جلد بازی نادانی ہے۔

۲۔ حلم زینت ہے۔

۳۔ صلۂ رحمی نعمت ہے۔

۴۔ راستبازی عزّت ہے۔

۵۔ جھوٹ عجز ہے۔

۶۔ بخل افلاس ہے۔

۷۔ سخاوت دولت مندی ہے۔

۸۔ نرمی عقلمندی ہے۔

۹۔ رازداری امانت ہے۔

۱۰۔ حُسنِ خُلق عبادت ہے۔

۱۱۔ عمل تجربہ ہے۔

۱۲۔ امداد دوستی ہے۔

۱۳۔ اچھے کام کرتے رہو مگر دل سے۔

۱۴۔ ایسا کام جو تم نے نہیں کیا، اس کا شمار نہ کرو۔
۱۵۔ حاجت مند نے تم سے سوال کر کے اپنی آبرو کا خیال نہ رکھا تو تم اس کی حاجت روائی کر کے اپنی آبرو قائم رکھو۔
۱۶۔ جو اپنے بھائی کی دنیاوی مصیبت میں کام آیا تو اللہ اس کی آخرت کی مصیبت دور کرتا ہے۔
۱۷۔ سب سے زیادہ معافی دینے والا وہ ہے جو بدلہ لینے کی قدرت رکھتا ہو اور پھر بدلہ نہ لے۔
۱۸۔ اپنی زیادہ تعریف کرنا ہلاکت کا باعث ہے۔
۱۹۔ عطا کے ذریعے نیک نامی حاصل کرو۔
۲۰۔ گمراہی سے شہرت پیدا نہ کرو۔
۲۱۔ جو سخاوت کرتا ہے سردار بنتا ہے جو کنجوسی کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے۔
۲۲۔ سب سے زیادہ سخی وہ ہے جو ایسے لوگوں کو بھی دیتا ہے جن سے ملنے کی امید نہ تھی۔
۲۳۔ جو کسی پر احسان کرتا ہے تو خدا اس پر احسان کرتا ہے اور خدا احسان کرنے والوں کو دوست بنا لیتا ہے۔
۲۴۔ سب سے زیادہ صلۂ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے جو ایسے شخص سے صلۂ رحمی کرے جس نے اس کے ساتھ صلۂ رحمی نہ کی ہو۔
۲۵۔ اگر کسی کے ساتھ نیک سلوک کیا اور دوسرا اس کے ساتھ ایسا نہ کر سکا تو اللہ اس کا نیک بدلہ دیتا ہے۔

مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا حضرت حسینؓ نے حضرت

حسن بصریؒ سے چند اخلاقی باتیں کیں۔ وہ انہیں سن کر بہت حیران ہوئے۔ سیدنا حسینؓ سے جان پہچان نہیں تھی جب وہ چلے گئے تو لوگوں سے پوچھا، یہ کون تھے ــــــ؟

جواب ملا، حسینؓ بن علیؓ۔

یہ سن کر حضرت حسن بصریؒ بے ساختہ بولے، تم نے میری مشکل حل کر دی یعنی اب حیرت کی کوئی بات نہیں۔
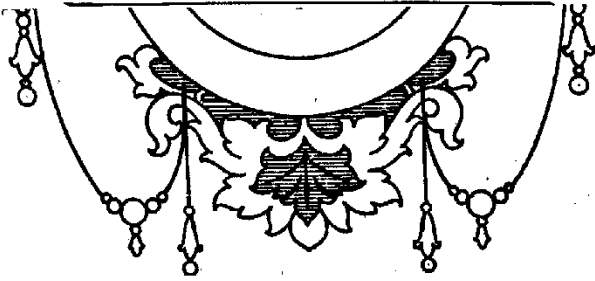
سیدۃ النساء ﷺ کی شیر دل بیٹی
خاتونِ کربلا حضرت زینبِ کبریٰ رضؓ

نام زینب اور کنیت اُمّ الحسن یا بروایتِ دیگر اُمّ کلثوم تھی واقعۂ کربلا کے بعد ان کی کنیت "اُمّ المصائب" بھی مشہور ہو گئی۔

حضرت زینب کبریٰؓ کے چند مشہور القاب یہ ہیں:
نائبۃ الزہراؑ، شریکۃ الحسینؑ، راضیہ بالقدر والقضا، شجاعہ، فصیحہ بلیغہ، زاہدہ فاضلہ۔

مستند روایات کے مطابق حضرت زینبؓ جمادی الاولیٰ ۵ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ رسولِ اکرم ﷺ اس وقت مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے تین دن بعد آپؐ تشریف لائے اور فاطمۃ الزہراؑ کے گھر تشریف لے گئے، بچی کو گود میں لیا اور بہت دیر تک روتے رہے پھر دہن مبارک میں کھجور چبائی اور لعاب مبارک بچی کے منہ میں ڈالا اس کے بعد حضورؐ نے بچی کا نام زینب تجویز کیا اور فرمایا " یہ ہم شبیہ خدیجہؓ ہے۔"

حضرت زینبؓ کی پرورش اور تربیت کا آغاز سرورِ کونین ﷺ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور سیدۃ النساءؓ کے زیرِ سایہ ہوا۔ ایک دن عہدِ طفلی میں حضرت زینبؓ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ بے خیالی میں سر سے اوڑھنی اتر گئی۔ سیدۃ النساءؓ نے دیکھا تو ان کے سر پر اوڑھنی ڈالی اور فرمایا، " بیٹی اللہ کا کلام ننگے سر نہیں پڑھتے۔"

ایک دن حضرت حسینؑ اور حضرت زینبؑ میں معصومانہ لڑائی ہو گئی۔ سیّدہ فاطمہؑ نے انہیں کلامِ مجید کی آیات پڑھ کر سنائیں اور فرمایا، "بچو لڑائی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے۔" دونوں بچے ڈر گئے اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی نہ لڑیں گے۔ فاطمۃ الزہراؑ بہت خوش ہوئیں اور انہیں سینے سے لگا لیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت زینبؑ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ کئی مرتبہ حسنینؑ کی طرح وہ بھی حضورؐ کے دوشِ مبارک پر سوار ہوئیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت زینبؑ بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی اور یہ ان کا پہلا سفر تھا۔

۱۱ھ ہجری میں جب حضورِ پُرنورؐ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے سیّدہ فاطمۃ الزہراؑ سے فرمایا کہ اپنے بچوں کو بلا لاؤ۔ وہ سب بچوں کو حضورؐ کے پاس لے گئیں۔ اپنے شفیق نانا کو بے چین دیکھ کر سب بچے رونے لگے۔ حضرت زینبؑ نے حضورؐ کے سینۂ مبارک پر اپنا سر رکھ دیا۔ آپؐ نے ان کی پیشانی چومی اور اپنا دستِ شفقت ان کے سر پر پھیر کر دلاسا دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت سیّدہ زینبؑ کی عمر تقریباً چھ برس کی تھی۔ چھ ماہ بعد شفیق والدہ سیّدہ زہرا بتولؑ نے بھی وفات پائی۔ ان حادثوں نے ننھی زینبؑ کو سخت صدمہ پہنچایا۔ شفیق نانا اور جاں نثار ماں کی جدائی سے حیدرِ کرارؑ کے سارے بچے غم و الم کی مورتیں بن گئے۔ شیرِ خداؑ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام خود سنبھالا اور کچھ مدت کے بعد ان کی نگرانی کے لیے اُمّ البنین بنت خزام کلابیہ سے نکاح کر لیا۔ علیؑ جیسے عالمِ معلّم ہوں تو شاگردوں کی خوش بختی کا کیا ٹھکانا۔

تھوڑی ہی مدت میں سارے بچوں کے دل و دماغ علم و حکمت کے خزانوں سے معمور ہو گئے۔ حضرت زینبؑ نے بھی اپنے جلیل القدر باپؑ کے علم اور دوسرے

اوصاف سے خوب استفادہ کیا حتیٰ کہ زہد و تقویٰ، عقل و فراست، حق گوئی و بے باکی، عفت و عصمت اور عبادت و شب بیداری میں مثلِ فاطمۃ الزہراؑ ہو گئیں۔ دراز قد اور متناسب الاعضا تھیں۔ چہرۂ مبارک پر اپنے نانا کا جلال تھا اور حرکات و سکنات اور چال ڈھال میں وقارِ حیدری نمایاں تھا۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علم و فضل میں قریش کی کوئی لڑکی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بے مثال خطیب تھے۔ وہ اپنے خطبات اور تقاریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے۔ حضرت زینبؓ کو اپنے عظیم باپ کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان ورثہ میں ملے۔ ان کے عدیم المثال خطبات تاریخ نے اپنے صفحوں میں محفوظ کر لیے ہیں، انہیں پڑھ کر کون سا دل ہے جو پگھل نہ جائے اور کونسی آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو جائے۔

اپنی لختِ جگر کے علم و فضل سے شیرِ خداؓ بھی مطمئن تھے۔ ان کے زمانۂ خلافت میں حضرت زینبؓ کا قیام کوفہ ہی میں رہا۔ کوفہ کی خواتین اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب پوچھا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ وہ چند عورتوں کے سامنے سورہ کٰھٰیٰعٓصٓ کی تفسیر بیان کر رہی تھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تشریف لائے اور بڑے غور سے اپنی لختِ جگر کی تقریر سنتے رہے جب بیان ختم ہوا تو آپؓ نہایت مسرور ہوئے اور فرمایا:

"جانِ پدر میں نے تمہارا بیان سنا اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم کلامِ الٰہی کے مطالب اتنے عمدہ طریقے سے بیان کر سکتی ہو۔"

❀

حضرت زینبؓ جب سنِ بلوغ کو پہنچیں تو قبیلہ کندہ کے رئیس اشعث بن قیس

نے ان کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بوجوہ انکار کر دیا۔
اس کے بعد حیدرِ کرار کے بھتیجے شہیدِ موتہ حضرت جعفر طیارؓ بن ابی طالب کے
فرزند عبداللہؓ اپنے عمِ محترمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت زینبؓ
کے ساتھ نکاح کے خواستگار ہوئے۔ حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد
رحمۃٌ للعالمینؐ نے خود عبداللہؓ کی پرورش و تربیت فرمائی تھی اور حضورؐ کے وصال
کے بعد سے جناب علی مرتضیٰؑ ان کے نگران و سرپرست تھے۔ وہ بڑے پاکیزہ
اخلاق کے حامل تھے اور سیرت و صورت میں جوانانِ قریش میں امتیازی حیثیت
رکھتے تھے۔ جناب مرتضیٰؑ نے ان کی درخواست قبول فرمالی۔ خاندان کے چند
بزرگ عبداللہ بن جعفرؓ کو ساتھ لے کر مسجد میں آگئے اور حضرت علی مرتضیٰؑ نے
نہایت سادہ طریق سے اپنی لختِ جگر زینبؓ کا نکاح ان سے پڑھا دیا۔ اس
وقت حضرت زینبؓ کی عمر بہ اختلافِ روایت گیارہ یا تیرہ سال کی تھی۔ نکاح
کے بعد خاندان کی عورتیں انہیں عبداللہ بن جعفرؓ کے گھر خود پہنچا آئیں۔ دوسرے
دن انہوں نے دعوتِ ولیمہ کی۔ مہر کی رقم کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے
بعض نے ۴۸۰ درہم لکھا ہے اور بعض نے چالیس ہزار۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اس
وقت تجارت کرتے تھے اور ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔

❀

حضرت زینبؓ کی خانگی زندگی نہایت خوشگوار تھی وہ اپنے شوہر کی بید
خدمت گزار تھیں اور وہ بھی ان کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے
اگرچہ گھر میں لونڈیاں بھی تھیں اور خادم بھی لیکن زیادہ تر گھر کا کام کاج وہ
خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ فرمایا کرتے تھے،
"زینب بہترین گھر والی ہے۔" حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بڑے فیاض

اور سخی تھے، سیدۃ النساءؑ کی بیٹی بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ ناممکن تھا کہ کوئی سائل یا حاجت مند ان کے دروازے پر آئے اور خالی ہاتھ چلا جائے یا کسی کی مصیبت کا انہیں پتہ چلے اور وہ اس کی خبر گیری نہ کریں۔ دونوں میاں بیوی کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کئی غیر مستحق لوگ بھی ان کے دست کرم سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ امام حسینؑ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے کہا، "اے ابن عم تم بہت اسراف سے کام لیتے ہو اور غیر مستحق لوگوں کو بھی اپنی کمائی میں شریک کر لیتے ہو۔"

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے جواب دیا، "اے بھائی کیا کروں سائل کو دیکھ کر دل قابو میں نہیں رہتا۔ اللہ نے مجھے دولت اسی لیے دی ہے کہ اس کے بندوں میں بانٹوں۔"

خاوند کے گھر میں دولت کی ریل پیل حضرت زینبؑ کے مزاج میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکی وہ بدستور صبر و قناعت، سادگی اور جفاکشی کا پیکر بنی رہیں۔

سنہ ۳۷ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہد خلافت میں کوفہ کو اپنا مستقر بنایا تو حضرت زینبؑ اور عبداللہ بن جعفرؓ بھی کوفہ آ گئے۔ کوفہ میں حضرت زینبؑ نہایت تندہی سے درس و تدریس اور وعظ و ہدایت کا کام انجام دیتیں۔ کوفہ کی اکثر خواتین ان کے پند و نصائح سے مستفیض ہوتیں۔ یوں ان کے علم و فضل کا چرچا گھر گھر پھیل گیا۔ ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسجد میں بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز تھے کہ ایک بدبخت خارجی عبدالرحمن بن ملجم نے زہر آلود تلوار سے بھرپور وار کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا۔ ابن ملجم کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ حضرت زینبؑ نے اسے دیکھا تو فرمایا، "او دشمن خدا تو نے امیرالمومنین کو زخمی کر ڈالا۔"

ابن ملجم نے کہا " امیر المومنین کو نہیں تمہارے باپ کو۔"

حضرت زینبؓ نے فرمایا " انشاء اللہ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

ابن ملجم نہایت بے حیائی سے جواب دیا، " تو پھر آہ و فغاں کیوں کرتی ہو۔ خدا کی قسم کئی روز میں نے اپنی تلوار کو زہر پلایا ہے۔"

اسی زہر آلود تلوار کے زخم سے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ —— ۲۱ رمضان المبارک سنہ ۴۰ ھ کو شہادتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو گئے۔ اپنے عالی مرتبہ اور معدنِ علم و فضل باپ کی شہادت سے حضرت زینبؓ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن ابھی ان کی قسمت میں اور بڑے بڑے صدمے لکھے تھے۔ سنہ ۴۹ ھ یا سنہ ۵۰ ھ میں انہیں اپنے شفیق برادرِ بزرگ سیدنا حضرت حسنؓ کی شہادت کا صدمہ سہنا پڑا۔ اس وقت وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھیں۔ ذی الحجہ سنہ ۶۰ ھ میں سیدنا حضرت حسینؓ نے اہل کوفہ کی دعوت پر اپنے اہل و عیال اور جاں نثاروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکہ سے کوفہ کا عزم کیا تو حضرت زینبؓ بھی اپنے دو فرزندوں کے ہمراہ اس مقدس قافلے میں شامل ہو گئیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اگرچہ خود اس قافلے میں شریک نہ ہو سکے تاہم انہوں نے حضرت زینبؓ اور اپنے بچوں کو سیدنا حسینؓ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ ۱۰ محرم الحرام سنہ ۶۱ ہجری کو کربلا کا دلدوز سانحہ پیش آیا جس میں حضرت زینبؓ کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچے، بھتیجے بھائی اور ان کے متعدد جاں نثار شامی فوج سے مردانہ وار لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت زینبؓ نے جس حوصلے، شجاعت اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نو اور دس محرم کی درمیانی شب کو سیدنا حضرت حسینؓ

کی تلوار صاف کی جانے لگی تو انہوں نے چند عبرت انگیز اشعار پڑھے اس وقت حضرت زینبؑ بے تاب ہوگئیں اور رو رو کر کہنے لگیں:

" اے کاش آج کا دن دیکھنے کے لیے میں زندہ نہ ہوتی۔ پہلے میرے نانا میری ماں میرے باپ اور میرے بھائی حسنؑ سب داغِ مفارقت دے گئے۔ اے بھائی اللہ کے بعد ہمارا سہارا اب آپ ہی ہیں ہم آپ کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے۔"

سیدنا حسینؑ نے فرمایا "زینب صبر کرو"

حضرت زینبؑ نے روتے ہوئے عرض کی، " میرے ماں جائے آپ کے بدلہ میں، میں اپنی جان دینا چاہتی ہوں۔"

سیدنا حسینؑ نے اپنی پیاری بہن کی دلدوز باتیں سن کر اشکبار ہو گئے لیکن نہایت حوصلہ سے فرمایا:

" اے بہن صبر کرو۔ خدا سے تسکین حاصل کرو۔ خدا کی ذات کے سوا ساری کائنات کے لیے فنا ہے۔ ہمارے لیے ہمارے نانا خیر البشرؐ کی ذات اقدس نمونہ ہے۔ تم انہی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا۔ اے بہن تمہیں خدا کی قسم ہے کہ اگر میں راہِ حق میں کام آجاؤں تو میرے ماتم میں گریبان نہ پھاڑنا، چہرہ کو نہ نوچنا اور بین نہ کرنا۔"

۱۰ محرم کو جب تمام جاں نثارانِ اہل بیت ایک ایک کر کے دوشِ رسولؐ کے سوار پر قربان ہو گئے تو جوانانِ اہل بیت کی باری آئی۔ ہم شبیہِ پیغمبر حضرت علی اکبر بن حسینؑ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تو حضرت زینبؑ "یا ابن اخاہ" کہتی ہوئی دیوانہ وار خیمہ سے باہر دوڑیں، اس بھتیجے کو انہوں

نے بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا، ان کی خاک و خون میں غلطاں لاش سے
چمٹ گئیں۔ حضرت حسینؑ نے انہیں وہاں سے اٹھا کر خیمہ کے اندر بھیجا
اور جوان فرزند کی لاش اٹھا کر خیمہ کے سامنے لے آئے۔

علی اکبرؑ کے بعد عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ، احمد بن حسنؑ، ابوبکر عبداللہ بن حسنؑ
جعفر بن عقیلؑ، عمر بن علیؑ، عثمان بن علیؑ اور دوسرے نوجوان سوائے سات
نفوس کے ایک ایک کر کے نہایت شجاعت سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زینبؑ کے دو فرزند عون بن عبداللہؑ
اور محمد بن عبداللہؑ بھی معرکۂ کربلا میں شہید ہوئے۔

ان کے بعد خانوادۂ نبوت کے باقی نوجوان بھی ایک ایک کر کے شہید
ہو گئے اور سیدنا حسینؑ تنہا رہ گئے۔ زین العابدینؑ بیمار تھے اور لڑائی کے
قابل نہیں تھے۔ انہیں اللہ اور اپنی بہن زینبؑ کے سپرد کیا اور سب کو خدا حافظ
کہہ کر فرزندِ رسولؐ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ پیاس کا غلبہ تھا اپنے جگر کے
ٹکڑوں اور جاں نثاروں کی شہادت سے دل ٹوٹا ہوا تھا لیکن اس قیامت
کا حملہ کیا کہ دشمن کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ حیدرِ کرارؑ کے فرزند جس طرف رُخ
کرتے دشمن کا دَل بادل کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ شامی بار بار نرغہ کرتے تھے
لیکن جونہی شمشیرِ حسینی چمکتی بھاگ کھڑے ہوتے۔ دوشِ رسولؐ کے سوار لڑتے
لڑتے زخموں سے چُور چُور ہو گئے لیکن اللہ رے ہیبت کہ کوئی تنہا سامنے
آنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جگھٹے بنا کر ہر طرف سے نیزوں خنجروں تیروں اور
تلواروں کا مینہ برسا رہے تھے۔ حصین بن نمیر نے ایک نیزہ پھینکا جو
گلوئے مبارک میں پیوست ہو گیا اور دہنِ مبارک سے خون کا فوارہ پھوٹ
پڑا۔ اپنے چلو میں تھوڑا سا خون لے کر آسمان کی طرف اچھالا اور فرمایا:

"مولا جو کچھ تیرے محبوبؐ کے نواسہ کے ساتھ کیا جا رہا ہے
تجھی سے اس کی فریاد کرتا ہوں۔"

حضرت زینبؑ نے دُور سے اپنے محبوب اور شفیق بھائی کو خون کی کلیاں کرتے دیکھا تو دوڑتی ہوئی رزمگاہ کے ایک قریبی ٹیلہ پر کھڑی ہو گئیں اور شامی فوج کے سردار عمر بن سعد (بن ابی وقاص) کو پکار کر کہا:

"اے عمر سعد کیا قیامت ہے کہ ابو عبداللہ قتل کیے جا رہے
ہیں اور تم دیکھ رہے ہو۔"

عمر بن سعد کی آنکھوں پر لالچ نے پردہ ڈال رکھا تھا لیکن پھر بھی سرورِ کونینؐ کے ماموں زاد بھائی کا فرزند تھا، فرطِ ندامت سے رونے لگا اور حضرت زینبؓ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ تاہم شامیوں کو ظلم سے روکنا اس کی قسمت میں نہ لکھا تھا، سیدنا حسینؓ حضرت زینبؓ کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے۔ سنگدل شامیوں نے شہیدانِ راہِ حق کے مقدس جسموں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا، سیدۃ النساءؓ کے لال کا سرِ اقدس نیزے پر چڑھایا اور پھر اہلِ بیت کے خیموں کا رُخ کیا۔ ایک بدبخت نے چاہا کہ حضرت علی (زین العابدینؒ) کو بھی (جو بیمار تھے) شہید کر دے لیکن حضرت زینبؓ ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور فرمایا:

"خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں اس بیمار کو کوئی قتل نہیں
کر سکتا۔"

ان کا عزم دیکھ کر وہ بدبخت اپنے ارادے سے باز آ گیا۔

۱۱ر محرم الحرام سنہ ۶۱ھ کو تمام پسماندگان کو جن میں کچھ خواتین بچے اور

علی (زین العابدینؑ) بن حسین تھے اسیر کر کے کوفہ کی طرف لے چلے۔ شہداء کے لاشے ابھی میدانِ کربلا میں بے گور و کفن ہی پڑے ہوئے تھے۔ جب یہ ستم زدہ قافلہ ان کے پاس سے گزرا تو اہلِ قافلہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے اور حضرت زینبؓ کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

"اے محمد مصطفےٰؐ آیئے دیکھئے آپ کے حسینؓ کا خون آغشتہ لاشہ چٹیل میدان میں پڑا ہے،
اس کا جسم پارہ پارہ کر دیا گیا ہے،
آپؐ کی لڑکیاں رسیوں میں جکڑی ہوئی ہیں
آپؐ کی ذریت قتل کر کے گرم ریت پر بچھا دی گئی ہے اور اس پر خاک اڑ رہی ہے،
اے میرے نانا یہ آپ کی اولاد ہے جسے ہنکایا جا رہا ہے،
ذرا حسینؓ کو دیکھئے اس کا سر کاٹ لیا گیا اور چادر چھین لی گئی ہے"

زینب کبریٰؓ کا یہ نوحہ سن کر دوست دشمن سبھی رو تے تھے۔ جب یہ مظلوم قافلہ کوفہ میں داخل ہوا تو کوفی ہزاروں کی تعداد میں انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ بے وفا کوفیوں کے ہجوم کو دیکھ کر شیرِ خداؓ کی بیٹی بے اختیار ہو گئی۔ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"لوگو! اپنی نظریں نیچی رکھو یہ محمد رسول اللہؐ کی لٹی ہوئی اولاد ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اہلِ کوفہ کے سامنے ایک عبرت انگیز خطبہ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیدرِ کرارؓ تقریر فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"اے کوفیو، اے مکارو، اے عہد شکنو! اپنی زبان سے پھر

جلنے والو، خدا کرے تمہاری آنکھیں ہمیشہ روتی رہیں تمہاری مثال ان عورتوں کی سی ہے جو خود ہی سوت کاتتی اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے ـــــ تم نے خود ہی میرے بھائی سے رشتۂ بیعت جوڑا اور پھر خود ہی توڑ ڈالا۔ تمہارے دلوں میں کھوٹ اور کینہ ہے تمہاری فطرت میں جھوٹ اور دغا ہے۔ خوشامد، شیخی خوری اور عہد شکنی تمہارے خمیر میں ہے۔ تم نے جو کچھ آگے بھیجا ہے وہ بہت بُرا ہے۔ تم نے خیر البشرؐ کے فرزند کو جو جنت کے جوانوں کے سردار ہیں قتل کیا ہے خدا کا قہر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

آہ کوفہ والو! تم نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو منہ بگاڑ دینے والا اور مصیبت میں مبتلا کر دینے والا ہے۔

یاد رکھو تمہارا رَبّ نافرمانوں کی تاک میں رہتا ہے، اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

اس خطبہ کو سن کر کوفیوں کو اس قدر ندامت ہوئی کہ ان میں سے اکثر کی روتے روتے گھگھی بندھ گئی۔ حذلم بن کثیر جو عرب کے فصیح ترین آدمیوں میں شمار ہوتا تھا، وہ بھی حضرت زینبؑ کا خطبہ سننے والوں میں شامل تھا۔ خطبہ سن کر وہ سیّدہ کے زورِ بیان اور فصاحت و بلاغت سے دنگ رہ گیا اور بے ساختہ اس کی زبان پر سیّدہؓ اور خاندانِ نبوّت کے لیے تعریف و تحسین کے کلمات جاری ہو گئے

❦

دوسرے دن کوفہ کے گورنر ابنِ زیاد نے دربار منعقد کیا۔ اسیرانِ اہلِ بیت کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت زینبؓ بہت خستہ حالت میں تھیں ابنِ زیاد

نے پوچھا : " یہ عورت کون ہے ؟ "
ایک لونڈی نے کہا ، " زینبؓ بنت علیؑ ہیں ۔"
ابن زیاد نے کہا ۔ " خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں رسوا کیا اور تمہاری جدتوں کو جھٹلایا ۔"
حضرت زینبؓ نے نہایت بے باکی سے جواب دیا ۔ " خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں عزت بخشی انشاءاللہ فاسق رسوا ہوں گے اور جھٹلائے جائیں گے ۔"
ابن زیاد نے کہا ، " تم نے دیکھا تمہارے بھائی اور اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہوا ؟ "
حضرت زینبؓ نے فرمایا ، " اللہ تعالیٰ نے انہیں درجۂ شہادت پر فائز کیا ۔ عنقریب وہ اور تم داورِ محشر کے سامنے جمع ہوں گے اس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس کا کیا حشر ہوتا ہے ۔"
ابن زیاد جھلا کر بولا ، " بنی ہاشم کے سب سے سرکش آدمی کے قتل سے میرا دل ٹھنڈا ہو گیا ہے ۔"
حضرت زینبؓ کو ابن زیاد کے اس طرح اظہارِ مسرت کرنے پر بڑا دکھ ہوا ۔ ان کا آبگینۂ دل حوادثِ کربلا سے ٹوٹ چکا تھا بے اختیار رو دیں اور فرمایا :
" خدا کی قسم تو نے ہمارے گھر والوں کو نکالا ، ہمارے ادھیڑوں کو قتل کیا ، ہماری شاخوں کو کاٹا ، ہماری جڑوں کو اکھاڑا ، اگر اسی سے تمہارا دل ٹھنڈا ہونا تھا تو ہو گیا ۔"
ابن زیاد سے کوئی جواب بن نہ پڑا ۔ اب اس کی نظر حضرت زین العابدینؒ

پر پڑی۔ پوچھا، "لڑکے تم کون ہو؟"
انہوں نے جواب دیا، "علی بن حسینؑ۔"
ابنِ زیاد نے عمر بن سعد سے پوچھا، "اسے کیوں نہیں قتل کیا؟"
اس نے جواب دیا، "بیمار ہے۔"
ابنِ زیاد نے کہا "اسے میرے سامنے قتل کر دو۔"
حضرت زینبؑ یہ حکم سن کر تڑپ اٹھیں اور بولیں:
"اے ابنِ زیاد کیا تو ابھی تک ہمارے خون سے سیر نہیں ہوا۔ کیا
اس نقاہت اور بیماری کے مارے ہوئے بچے کو بھی مار دو گے۔
اگر اسے قتل کرنا ہے تو اس کے ساتھ مجھے بھی مار ڈال۔"
یہ کہہ کر حضرت زین العابدینؑ سے چمٹ گئیں۔ ابن زیاد کے دل میں کچھ خیال آگیا اور اس نے حکم دیا کہ اس لڑکے کو عورتوں کے ساتھ رہنے کے لیے چھوڑ دو۔ چند دن بعد ابنِ زیاد نے شہداء کے سروں اور اسیرانِ اہلِ بیت کو فوج کے پہرے میں یزید کے پاس دمشق روانہ کر دیا۔

❦

کوفہ سے دمشق تک کے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد اسیرانِ اہلِ بیت یزید کے دربار میں پیش کیے گئے۔ ایک سرخ رنگ کے شامی نے فاطمہ بنتِ حسینؑ یا بروایتِ دیگر سکینہ بنتِ حسینؑ کی طرف اشارہ کر کے کہا "امیر المؤمنین یہ لڑکی مجھے دے دیجئے۔"
حضرت زینبؑ تڑپ اٹھیں اور بولیں —— "خدا کی قسم یہ لڑکی نہ تجھے مل سکتی ہے اور نہ یزید کو جب تک کہ اللہ کے دین کو ترک کرنے کا اعلان نہ کر دے۔"

شامی نے دوبارہ یہی سوال کیا لیکن یزید نے اسے روک دیا۔
جب امام حسینؑ کا سرِ اقدس یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو خواتین اہلِ بیت رونے لگیں۔ حضرت زینبؑ نے سرِ اقدس کی طرف مخاطب ہو کر کہا:
"اے حسینؑ، اے محمد مصطفےٰ صلعم کے دل بند، اے دوشِ پیمبرؐ کے سوار، اے فاطمۃ الزہراؑ کے لختِ جگر، اے جنّت کے جوانوں کے سردار۔"
یزید نے پوچھا۔ "یہ عورت کون ہے؟"
اسے بتایا گیا کہ حسینؑ کی چھوٹی بہن زینبؑ ہیں۔
یزید نے حضرت زینبؑ سے مخاطب ہو کر کہا "کیا تمہارا بھائی یہ نہیں کہتا تھا کہ میں یزید سے بہتر ہوں اور میرا باپ یزید کے باپ سے بہتر تھا۔"
حضرت زینبؑ نے دلیری سے جواب دیا، "بے شک میرا بھائی سچ کہتا تھا۔"
یزید نے کہا۔ "میری عمر کی قسم، حسینؑ کے نانا میرے دادا سے بہتر تھے، حسینؑ کی ماں میری ماں سے بہتر تھیں۔ رہا میرا باپ اور حسینؑ کا باپ تو سب کو معلوم ہے کہ خدا نے کس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔"
اس پر حضرت زینبؑ نے یزید اور اس کے اہلِ دربار کو مخاطب کر کے ایک دردناک تقریر کی۔ انہوں نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:
"اے یزید گردشِ افلاک اور ہجومِ آفات نے مجھے تجھ سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔ یاد رکھ رب العزت ہم کو زیادہ عرصہ تک اس حال میں نہ رکھے گا۔ ہمارے مقاصد کو ضائع نہ کرے گا۔ تو نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا اپنے آپ کو پہنچایا ہے۔ آہ تیرے

آدمیوں نے دوشِ رسولؐ کے سوار اور اس کے بھائیوں، فرزندوں اور رفقاء کو نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا۔ انہوں نے پردہ نشینانِ اہلِ بیت کی بے حرمتی کی۔ اے کاش تو اس وقت شہیدانِ کربلا کو دیکھ سکتا تو اپنی ساری دولت و حشمت کے بدلے اُن کے پہلو میں کھڑا ہونا پسند کرتا۔ ہم عنقریب اپنے نانا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان مصائب کو بیان کریں گے جو تیرے بے درد ہاتھوں سے ہمیں پہنچے ہیں اور یہ اس جگہ ہوگا جہاں اولادِ رسولؐ اور ان کے ساتھی جمع ہوں گے۔ ان کے چہروں کا خون اور جسموں کی خاک صاف کی جائے گی۔ وہاں ظالموں سے بدلہ لیا جائے گا۔ حسینؑ اور اُن کے ساتھی مرے نہیں اپنے خالق کے پاس زندہ ہیں اور وہی ان کے لیے کافی ہے۔ وہ عادلِ حقیقی نبیؐ کی اولاد اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے والوں سے ضرور بدلہ لے گا۔ وہی ہماری امیدگاہ ہے اور اسی سے ہم فریاد کرتے ہیں۔"

❀

سیدہ زینبؑ کا خطبہ سن کر یزید اور اس کے درباری سکتے میں آ گئے۔ یزید کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں لوگ خاندانِ رسالت کی حمایت میں میرے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اس نے خواتین اہلِ بیت کو اپنے خاص حرم سرا میں ٹھہرایا اور جہاں تک ہو سکا ان کی دلجوئی کی کوشش کی۔ چند دن بعد اس نے حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ کے زیرِ حفاظت قافلۂ اہلِ بیت کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔

جب قافلہ چلنے لگا تو حضرت زینبؑ نے فرمایا:

"محملوں پر سیاہ چادریں ڈال دو تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ سیدۃ النساءؑ کی دلفگار اولاد ہے۔"

حضرت نعمانؓ نے جہاں تک ہو سکا ان مصیبت زدہ مسافروں کی مدد کی اور راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ جب یہ قافلہ کربلا پہنچا تو وہاں حضرت جابر بن عبداللہؓ اور بنی ہاشم کے کچھ لوگ پہنچے ہوئے تھے انہیں دیکھ کر حضرت زینبؑ رونے لگیں۔ اس موقع پر موجود دوسرے سب لوگ بھی رونے لگے۔ جب قافلہ مدینہ منورہ پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ فاتح خیبرؓ کی عفیفہ بیٹیوں زینبؑ اور فاطمہؓ نے حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ کو ان کے حسنِ سلوک کے عوض اپنی چوڑیاں اتار کر بھیجیں اور فرمایا کہ اس وقت ہمارے پاس اور کچھ نہیں کہ آپ کی خدمت کا معاوضہ دیں۔

نعمانؓ اشکبار ہو گئے اور کہا "اے بناتِ رسولؐ خدا کی قسم میں نے جو کچھ کیا ہے صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے کیا ہے یہ چوڑیاں آپ ہی کو مبارک ہوں۔"

اس دن سارا مدینہ منورہ سوگوار تھا۔ ہزاروں لوگوں نے روتے ہوئے ان مصیبت زدہ مسافروں کی پیشوائی کی۔ حضرت زینبؑ روضۂ نبوی پر حاضر ہوئیں تو ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا اور زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

"اے میرے مقدس نانا جان میں آپؐ کے فرزند اور اپنے بھائی حسینؓ کی شہادت کی خبر لائی ہوں۔ آپؐ کی اولاد کو رسیوں سے باندھ کر کوفہ اور دمشق کی گلیوں میں پھرایا گیا۔"

حضرت زینبؓ کے الفاظ سن کر ہر شخص رونے لگا۔ پھر وہ اپنی والدہ ماجدہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراءؓ کے مزار پر گئیں اور اس درد سے روئیں کہ پتھر دل کا کلیجہ بھی پانی ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں سے ملیں، انہیں اپنی روداد غم سنائی اور سب کو صبر کی تلقین کی۔

بے پناہ مصائب نے حضرت زینبؓ کے دل و جگر کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی سنہ ۶۲ھ میں انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور یوں یتیمانِ اہلِ بیت کی سرپرست، شہدائے کربلا کی یادگار اور دشمنوں کو عذابِ خدا سے ڈرانے والی بے مثال خطیبہ اپنے محبوب و مظلوم بھائی سے جنت الفردوس میں جا ملیں۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت زینبؓ اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے ساتھ شام چلی گئیں۔ دمشق کے پاس حضرت عبداللہؓ کی کچھ زمینداری تھی وہاں پہنچنے کے بعد بیمار ہوئیں اور وہیں رحلت فرمائی۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت زینبؓ شہیدانِ کربلا کے مصائب نہایت درد انگیز لہجہ میں کمال فصاحت و بلاغت سے لوگوں کو سنایا کرتی تھیں لوگ ان سے بہت متاثر ہوتے اور ان میں اہلِ بیت کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ عاملِ مدینہ نے ان حالات کی اطلاع یزید کو دی۔ اُس نے حکم بھیجا کہ زینبؓ کو کسی دوسرے شہر میں بھیج دو۔ حضرت زینبؓ نے پہلے تو جانے سے انکار کیا پھر بعض ہوا خواہوں کے سمجھانے بجھانے سے رضامند ہو گئیں اور سکینہؓ و فاطمہؓ بناتِ حسینؑ اور کچھ دوسری قرابت دار خواتین کے ہمراہ مصر چلی گئیں، وہاں کے والی حضرت مسلمہؓ بن مخلد انصاری نے ان کی نہایت عزت و تکریم کی اور اپنے دارالاقامہ میں ٹھہرایا۔ تقریباً ایک سال بعد (سنہ ۶۳ھ میں) حضرت زینبؓ نے وہیں وفات پائی۔

واللہ اعلم بالصواب

حضرت اُمِّ کلثومؓ بنتِ علیؓ

حضرت زینب صغریٰؓ جن کی کنیت اُمِّ کلثومؓ تھی، حضرت علیؓ اور سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ کی چھوٹی بیٹی تھیں (بڑی حضرت زینب کبریٰؓ تھیں) کتاب "ارشادِ شیخ مفید" میں اس کی تصریح یوں کی گئی ہے:-

"وَ اَوْلَادُ اَمِیْرِالْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْہِ السَّلَامُ سَبْعَۃٌ وَّ عِشْرُوْنَ وَلَدًا ذَکَرًا اَوْ اُنْثٰی اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ وَ زَیْنَبُ الْکُبْرٰی وَ زَیْنَبُ الصُّغْرٰی اَلْمُکَنَّاۃُ بِاُمِّ کُلْثُوْم اُمُّھُمْ فَاطِمَۃُ الْبَتُوْلِ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ بِنْتِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ۔"

(امیرالمؤمنین علیہ السّلام کی اولاد میں ستائیس بیٹے اور بیٹیاں تھیں، الحسنؓ، الحسینؓ، زینب کبریٰؓ، زینب صغریٰؓ جن کی کنیت اُمِّ کلثوم تھی، ان سب کی والدہ تمام جہانوں کی خواتین کی سردار فاطمۃ البتولؓ تمام رسولوں کے سردار کی بیٹی ہیں)

(محبِ اہلِ بیت کون؟ از سید شبیر حسین شاہ بحوالہ ارشادِ شیخ مفید مطبوعہ تہران ص ۱۶۷)

حضرت اُمِّ کلثومؓ کا پہلا نکاح امیرالمؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے ہوا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے "الفاروق" میں حضرت عمر فاروقؓ کی "ازواج و اولاد" کے باب میں اس نکاح کا حال بدیں الفاظ بیان کیا ہے:-

"اخیر عمر میں اُن (حضرت عمرؓ) کو خیال ہوا کہ خاندانِ نبوّت سے

تعلق پیدا کریں جو مزید شرف اور برکت کا باعث تھا۔ چنانچہ
جناب امیر (حضرت علیؑ) سے حضرت اُمّ کلثومؓ کے لیے
درخواست کی۔ جناب ممدوحؑ نے پہلے اُمّ کلثومؓ کی صغر سنی
کے سبب سے انکار کیا لیکن حضرت عمرؓ نے زیادہ تمنا ظاہر کی اور
کہا کہ اس سے مجھے حصولِ شرف مقصود ہے جو جناب امیرؑ نے
منظور فرمایا اور ۱۷ھ ہجری میں ۴۰ ہزار مہر پر نکاح ہوا۔"
علامہ شبلیؒ نے حاشیہ میں اس عبارت کی تشریح یوں کی ہے:
"حضرت اُمّ کلثوم بنتِ فاطمہؓ کی تزویج کا واقعہ تمام معتمد مورخین
نے تفصیل سے لکھا ہے۔ علامہ طبریؒ نے "تفسیر کبیر" میں، ابن حبان
نے "کتاب الثقات" میں، ابن قتیبہ نے "معارف" میں
اور ابن اثیرؒ نے "کامل" میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اُمّ کلثوم
بنتِ فاطمہ زہراؓ حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں۔ ایک دوسری اُمّ کلثوم
بھی ان کی زوجہ تھیں لیکن ان مؤرخوں نے صاف تصریح کی ہے۔
علامہ طبری و ابن حبان و ابن قتیبہ کی تصریحات میری نظر سے
گزری ہیں اور ان سے بڑھ کر تاریخی واقعات کے لیے اور کیا سند
ہو سکتی ہے میں وہ عبارتیں اس موقع پر نقل کرتا ہوں۔ "ثقات"
میں ذکرِ خلافت حضرت عمرؓ واقعات ۱۷ھ ہجری میں ہے:
"ثم تزوج عمر ام کلثوم بنت علیؓ بن ابی طالب
بنت فاطمہؓ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"
"اُسد الغابہ فی احوال الصحابہ" میں ابن اثیر نے جہاں حضرت
اُمّ کلثومؓ کا حال لکھا ہے تفصیل کے ساتھ ان کی تزویج کا واقعہ

نقل کیا ہے۔ اسی طرح طبری نے جا بجا تصریح کی ہے جس کو ہم تطویل کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صحیح بخاری میں ایک ضمنی موقع پر حضرت اُمِ کلثومؓ کا ذکر آگیا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورتوں میں چادریں تقسیم کیں۔ ایک بچ رہی۔ اس کے متعلق تردّد تھا کہ کس کو دی جاوے۔ ایک شخص نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اعط ھٰذَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عِنْدَ یَزِیْدَ اُمَّ کُلْثُوْم"

(صحیح بخاری باب الجہاد مطبوعہ میرٹھ صفحہ ۲۰۳)

اس میں صاف تصریح ہے کہ اُمِ کلثوم جو حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں، خاندانِ نبوّت سے تھیں۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضرت اُمِ کلثومؓ کے بطنِ مبارک سے حضرت عمرؓ کا ایک بیٹا زید پیدا ہوا ماں اور بیٹا دونوں ایک ہی ساعت میں فوت ہو گئے۔
مولانا سید شبیر حسین شاہ نے اپنی کتاب "محبِ اہلِ بیت کون؟" میں حضرت جعفر صادقؒ کی یہ روایت نقل کی ہے:

"اُمِ کلثومؓ بنت علیؓ اور اُمِ کلثومؓ کا بیٹا زید بن عمرؓ بن خطاب دونوں ایک ساعت میں اکٹھے فوت ہوئے۔"

(محبِ اہلِ بیت کون" بحوالہ تہذیب الاحکام ص ۳۸۰)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی صلب سے حضرت اُمِ کلثومؓ کی ایک بیٹی رقیہ بھی پیدا ہوئی۔ وہ بھی صغر سنی میں فوت ہو گئی۔
بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت اُمِ کلثومؓ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت

کے بعد عرصہ تک زندہ رہیں۔ انہوں نے نکاح ثانی عون بن جعفرؓ بن ابی طالب سے کیا۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ عون کی رحلت کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفرؓ نے ان سے نکاح کیا۔ ان سے ایک لڑکی ہوئی جو لڑکپن میں فوت ہوگئی۔ واللہ اعلم بالصواب ——— (الزہراء عمر ابوالنصر بحوالہ تہذیب النووی۔ سیرۃ کبریٰ جلد دوم، ابوالقاسم رفیق دلاوری)

حضرت فضہؓ

(سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کی وفادار کنیز)

حضرت فضہؓ، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی کنیز تھیں۔ ارباب سیر نے اس کی تصریح نہیں کی کہ وہ سیدہ فاطمہؓ کی حیات پاک کے کس دور میں ان کی خدمت میں آئیں البتہ مختلف روایتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ زندگی بھر خاندان نبوت سے وابستہ رہیں۔ بعض روایتوں میں ان کا وطن حبش بیان کیا گیا ہے اور بعض میں نوبیہ (سوڈان)۔ ان کے شرف صحابیت پر سب اہل سیر کا اتفاق ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا اصل نام میمونہ تھا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر فضہ رکھا۔

حضرت فضہؓ نہ صرف گھر کے کام کاج میں سیدہ فاطمہؓ کا ہاتھ بٹاتی تھیں بلکہ ان کے ہر دکھ سکھ میں بھی شریک رہتی تھیں۔ اس طرح وہ حضرت علیؓ کے گھر کا ایک فرد بن گئی تھیں۔ علامہ طبری کا بیان ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ نے وفات پائی تو ان کو غسل دیتے وقت حضرت فضہؓ بھی موجود تھیں۔ سیدہؓ کا جنازہ اٹھنے لگا تو حضرت علیؓ نے اہل خانہ کو اس طرح آواز دی :-

"اے ام کلثوم، اے زینب، اے فضہ، اے حسن، اے حسین آؤ اور اپنی ماں کو آخری بار دیکھ لو۔ اب تمہاری جدائی ہو رہی ہے اور پھر جنت میں ہی ملاقات ہو گی۔"

سیّدہ فاطمہؑ کی وفات کے بعد حضرت فضّہؓ سیّدہ زینبؑ بنت علیؑ کی کنیزی میں آگئیں اور مصائبِ کربلا میں ان کے ساتھ شریک رہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت فضّہؓ کا نکاح ابو ثعلبہ حبشیؓ سے کردیا تھا۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ابو ثعلبہؓ کی وفات کے بعد ان کا نکاح ابو سلیک غطفانیؓ سے ہوا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت فضّہؓ کی ایک لڑکی (مسکہ) اور پانچ لڑکے تھے۔

حضرت فضّہؓ کے سالِ وفات کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ملتی البتہ بعض اربابِ سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ حضرت زینبؑ بنت علیؑ کی رحلت کے چند سال بعد فوت ہوئیں اور ان کی قبر حضرت زینبؑ کی قبر کے ساتھ شام میں ہے۔
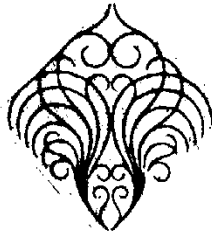
خواتینِ اسلام سے اسلام کے مطالبے

- اپنی زیب و زینت کی چیزوں کا مردوں پر اظہار نہ ہونے دیں۔
- اپنے زیورات کی آواز تک غیر محرموں کے کان تک نہ جانے دیں۔
- خوشبو، عطر وغیرہ لگا کر گھر سے باہر نہ نکلیں۔
- مردوں سے گفتگو کرتے وقت لب و لہجہ اور آواز میں نزاکت پیدا نہ کریں۔
- راہ چلتے یا مرد سے باتیں کرتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھیں۔
- ایسے راستہ سے نہ گزریں جہاں مردوں کی ریل پیل ہو بلکہ کنارے کنارے ہو کر گزریں۔
- گھر سے باہر نکلنے کے بعد اپنی چال ڈھال میں حیا کو مقدم رکھیں۔
- کسی غیر عورت کی صفت اپنے خاوند سے بیان نہ کریں۔
- کسی غیر محرم کے ساتھ سفر نہ کریں خواہ سفرِ حج ہی کیوں نہ ہو۔
- اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔

خواتینِ اسلام سے خطاب

ماہر القادری (مرحوم)

یہ شرح آیۂ عصمت ہے جو ہے بیش نہ کم
دل و نظر کی تباہی ہے قُربِ نامحرم
حیا ہے آنکھ میں باقی نہ دل میں خوفِ خدا
بہت دنوں سے نظامِ حیات ہے برہم
یہ سینما یہ کلب گھر یہ مدرسے[1] یہ چمن[2]
انہیں کے بھیس میں شیطان نے لیا ہے جنم
یہ سیر گاہیں کہ مقتل ہیں شرم و غیرت کے
یہ معصیت کے مناظر ہیں زینتِ عالم
یہ نیم باز سا برقع یہ دیدہ زیب نقاب
جھلک رہا ہے جھلا جھل قمیص کا ریشم
تری حیات ہے کردارِ رابعہ بصریؒ
ترے فسانے کا موضوع عصمتِ مریمؑ

---

[1] کالج [2] پارک

حجاب و شرم و حیا زندگی ہے عورت کی
جو یہ نہ ہو تو برابر ہے پھر وجود و عدم
نہ دیکھ رشک سے تہذیب کی نمائش کو
کہ سارے پھول یہ کاغذ کے ہیں خدا کی قسم

وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم
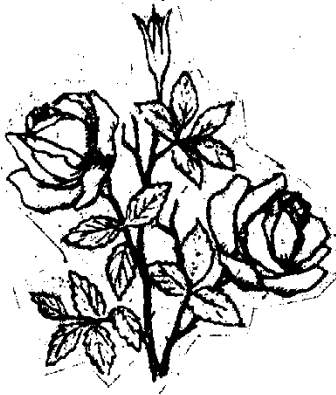
کتابیات

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جن کتابوں سے بلا واسطہ یا بالواسطہ خاص طور پر مدد لی گئی ہے ان کے نام یہ ہیں :

۱۔ صحیح بخاری
۲۔ صحیح مسلم
۳۔ مسندِ ابوداؤد
۴۔ جامع ترمذی
۵۔ مستدرکِ حاکم
۶۔ الطبقات الکبریٰ ——— ابنِ سعدؒ
۷۔ السیرۃ النبویہ ——— ابنِ ہشامؒ
۸۔ اُسدُ الغابہ ——— ابنِ اثیرؒ
۹۔ الکامل فی التاریخ ——— ابنِ اثیرؒ
۱۰۔ البدایہ والنہایہ ——— ابنِ کثیرؒ
۱۱۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ——— حافظ ابنِ عبدالبرؒ
۱۲۔ الاِصابہ فی تمییز الصحابہ ——— حافظ ابنِ حجرؒ
۱۳۔ تہذیب التہذیب ——— حافظ ابنِ حجرؒ
۱۴۔ تاریخ الامم والملوک ——— ابنِ جریر طبریؒ
۱۵۔ تاریخ ابنِ عساکر ——— ابنِ عساکرؒ

۱۶۔ مدارج النبوۃ ——— شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

۱۷۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ (مختلف جلدیں) دانش گاہ پنجاب لاہور

۱۸۔ سیرۃ کبریٰ ——— ابوالقاسم رفیق دلاوریؒ

۱۹۔ سیرۃ عائشہؓ ——— سید سلیمان ندویؒ

۲۰۔ سیر الصحابیات ——— مولانا سعید انصاری مرحوم

۲۱۔ سیر الصحابہ جلد اوّل و دوم ——— مولانا سعید انصاری مرحوم

۲۲۔ سیر الصحابہ جلد ششم ——— مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

۲۳۔ خلفاء راشدینؓ ——— مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

۲۴۔ خاتونِ جنت ——— منشی تاج الدین احمد تاج مجددی

۲۵۔ الحسینؓ ——— عمر ابوالنصر

۲۶۔ الزہراء ——— عمر ابوالنصر

۲۷۔ فاطمہؓ بنت محمدؐ ——— رئیس احمد جعفری مرحوم

۲۸۔ سیرتِ فاطمۃ الزہراءؓ ——— مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم

۲۹۔ سیدہ فاطمہ زہراءؓ ——— ابومحمد امام الدین رام نگری مرحوم

۳۰۔ خاتونِ جنت فاطمہ زہراءؓ ——— ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم

۳۱۔ خلفاء راشدینؓ کی یگانگت ——— منشی عبدالرحمٰن خان

۳۲۔ تسبیح فاطمہؓ ——— علامہ فضل احمد عارف

۳۳۔ فدک ——— غلام مصطفےٰ چشتی مرحوم

۳۴۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور (علیؓ نمبر) مرتبہ مجیب الرحمٰن شامی

۳۵۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور (صدیق اکبرؓ نمبر) مرتبہ خواجہ عابد نظامی

طالب الہاشمی
● صحابہؓ کی پاکیزہ زندگی کے حالات
● صحیح واقعات و حالات پر مبنی تحقیق ● بے شمار کتب کا نچوڑ
● منفرد اندازِ تحریر ● دل میں اتر جانے والا اسلوبِ نگارش